BEGINNING FROM JERUSALEM

JOHN FOSTER

دیباچہ

مدیر اعلیٰ

بیسویں صدی کا آغاز مسیحی کلیسیا کے لئے ایک اُمید کا دَور تھا۔ مغربی کلیسیائیں ایمان میں مضبوط اَور متموّل نظر آتی تھیں اَور ممتاز المرتبہ جدید کلیسیائیں دُنیا کے تقریباً تمام حصّوں میں بڑی تیزی سے ترقّی کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انجیل کی خوشخبری بغیر کسی شدید مخاصمت و مخالفت کے تمام رُوئے زمین پر پھیلتی چلی جائے گی۔ لیکن اس مشاہدہ کے پچاس سال کے عرصہ کے بعد اب ساری چیزوں کا رنگ رُوپ بدل چُکا ہے۔ ہر ایک مسیحی جانتا ہے کہ موجودہ ایّام کلیسیا کے لئے مشکلات کے ایّام ہیں۔ قدیم مذاہب انجیلِ مقدّس کی مزاحمت کے لئے نئی زندگی اَور نئی قوّت حاصل کر رہے ہیں۔ جدید معتقدات (مثلاً اشتراکیت) کروڑوں ایمانداروں کو اپنی طرف جذب کر رہے ہیں۔ مسیحیوں کا ایمان ہے کہ خُداوند یسُوع مسیح انسان کے لئے خُدا کا آخری کلام ہے اَور کُل مُستقبل اُسی کے دستِ مُبارک میں ہے۔ وُہ اس امر سے بھی باخبر ہیں کہ مسیحی ایمان کبھی بھی زندہ نہیں رہ سکتا اَور نہ نشوونما پا سکتا ہے جب تک مجموعی طور سے کلیسیائیں اَور انفرادی طور سے مسیحی لوگ اپنے ایمان کی گواہی کے لئے

یروشلیم سے آغاز

مُصنفہ

جان فاسٹر پروفیسر تواریخ کلیسیا گلاسگو یونیورسٹی

مُترجمہ

اے۔ ڈی۔ خلیل بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

پنجاب ریلجس بک سوسائٹی

انارکلی۔ لاہور

بار اوّل　　　　۱۹۶۵ء　　　　تعداد ۱۰۰۰

نئی زندگی، نیا اعتقاد اور نئی قوت حاصل نہ کریں۔ موجودہ ایام میں ہر مسیحی کو انجیل مقدس کا بغور مطالعہ نہایت لازمی و لابدی ہے۔

آج کی دنیا میں محض اعتقاد رکھنا ہی کافی نہیں۔ ہمارے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ ہم اس کی تفہیم بھی حاصل کریں۔ دنیا کے ہر حصہ سے دینی کتابوں کی مانگ پیدا ہو رہی ہے جن کے مطالعہ سے ہر ایک مسیحی اپنے ایمان کی سوجھ بوجھ حاصل کر سکے تاکہ وہ ان سوالات کے جوابات معلوم کر سکے جو آج اس سے اور دیگر مسیحیوں سے پوچھے جاتے ہیں اور وہ اس بات کو سمجھے کہ اپنے ایمان کو کس طرح دوسرے لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہئے۔ یہ خاص مسیحی کتب کا سلسلہ اس خاص مسیحی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ یہ کتب خاص طور پر نئی پود کی کلیسیاؤں کے لئے ہیں تاہم موجودہ حالات زندگی میں اب نئی اور پرانی کلیسیاؤں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ تمام کلیسیاؤں کے مد مقابل ایک ہی قسم کے مسائل درپیش ہیں۔ تمام ممالک میں ایک ہی طرح کے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ یہ سلسلۂ کتب اُن لوگوں کے لئے تیار کیا گیا ہے جنہیں تبلیغ و تدریس کی تربیت چاہئے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ جو مواد ان کتب میں پیش کیا گیا ہے ایسے لوگوں کی معاونت کرے گا تاکہ وہ اپنے کام کو زیادہ مؤثر طریق سے سرانجام دے سکیں۔ ہمارا نصب العین یہ رہا ہے کہ ہم ان خیالات کو ایسی سادہ عبارت میں لکھیں کہ عام شرکائے کلیسیا جو اپنے ایمان کا مطالعہ کرنے کے خواہشمند ہیں اس سلسلۂ کتب کو انفرادی اور مجموعی مطالعہ کی صورت میں استعمال کر سکیں تاکہ وہ مسیحی ایمان کے علم اور اُس کی معرفت میں نشوونما پائیں۔

یہ سلسلۂ کتب پہلے پہل زبان انگریزی میں چھپ رہا ہے لیکن ہمارا ارادہ ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو یہ کتب مسیحی دنیا کی تمام [illegible] زبانوں میں ترجمہ ہو کر عوام کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں۔ اس سلسلۂ کتب کے مصنفین کو دنیا کے مختلف ممالک اور کلیسیائے عالمگیر کی مختلف شاخوں سے منتخب کیا گیا ہے۔

اس مہم کے لئے خاص زور نئی کلیسیاؤں پر دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عظیم الشان کام کو سرانجام دینے کے لئے مختلف انداز میں پیدا ہوں گی لیکن ہمارا نصب العین اور اُمید یہ ہے کہ ہم مختلف خیالات اور مختلف زبانوں کے وسیلہ کلیسیا کے ایمان کو جو ایک خداوند پر ہے، ہر ممکن طریق سے دنیا کے سامنے پیش کریں۔

سٹیفن نیل
(بشپ)

مندرجات

پہلا باب

یروشلیم سے آغاز

چاروں انجیلوں میں ہر ایک کے آخر میں دو باتوں کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے - اوّل - نوید فتح - کیونکہ ایک بہت بڑا کام مکمل ہو چکا ہے - دوم - ایک ایسے کام کا چیلنج دیا جاتا ہے جو ابھی شروع ہونے والا ہے (متی ۲۸ : ۱۸-۲۰، مرقس ۱۶: ۱۵، ۱۹، ۲۰، لوقا ۲۴ : ۴۴ - ۴۹) - ہمارا خداوند دُنیا میں رہا، مر گیا اور مُردوں میں سے جی اُٹھا - وہ اپنے شاگردوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ تمام دُنیا میں جا کر اس خوشخبری کی مُنادی کریں - پس مقدس لوقا رسول نے یہ لکھا ہے "اے تھیوفلس! میں نے پہلا رسالہ اُن سب باتوں کے بیان میں تصنیف کیا جو یسوع شروع میں کرتا اور سکھاتا رہا" - اس کے بعد اُسے دُوسرا رسالہ یعنی "رسُولوں کے اعمال" کی کتاب بھی تصنیف کرنی پڑی - اس رسالے میں خداوند یسوع مسیح کے اُس کام کا بیان ہے جو اُن شاگردوں نے جاری رکھا جنہیں اُس نے مُنادی کے لئے بھیجا تھا - "رسُولوں کے اعمال" کی کتاب

تواریخِ کلیسیا کی اوّلین کتاب ہے۔ ہم اس کہانی کا ساٹھ [illegible] تک مطالعہ کریں گے حتیٰ کہ یہ "زمین کی انتہا تک" پہنچ جائے گی۔ مقدّس لُوقا رسُول نے اپنی انجیل کے خاتمہ پر ۲۴: ۴۷ میں ایک محاورہ استعمال کیا ہے اور اپنے دُوسرے رسالے کے آغاز میں (اعمال ۱: ۸) پھر یہی خیال ظاہر کرتا ہے یعنی "یروشلیم سے شرُوع کرکے"۔ اس کے ایک سو سال بعد مسیحیت کے ایک دشمن مُصنّف سیلسسؔ[1] نے مسیحیت کے فلسطینی ہونے کا مضحکہ اُڑایا۔ "اگر خُدا بنی نوعِ انسان کو بچانا چاہتا تھا تو اُس نے اپنے رُوح کو دُنیا کے ایک کونے میں کیوں بھیجا؟ کسی مذاقیہ ڈرامے کا مُصنّف ہی یہ تصوّر کرسکتا ہے کہ خُدا کا بیٹا یہُودیوں کے پاس بھیجا گیا۔" لیکن دُنیا کے نقشے سے معلُوم ہوتا ہے کہ فلسطین ایک کونہ نہیں ہے بلکہ ایک راستہ ہے جو برّاعظم یورپ، ایشیا اور افریقہ کو ایک دُوسرے سے ملاتا ہے۔ عہدِ عتیق کی تواریخ کا پس منظر یہی راستہ ہے اور قدیم تہذیبوں کے وُہ دو علاقے ہیں جنہیں یہ راستہ ملاتا ہے۔ بنی اسرائیل مصر میں غلام تھے۔ مصر کی سلطنت شمالی افریقہ میں دریائے نیل کی وادی میں تھی۔ وُہ شاہِ مصر فرعون کی غلامی سے نکلے اور فلسطین میں بڑی بے سروسامانی اور ناسازگار حالات میں رہنے لگے۔ حالات اس وجہ سے ناسازگار تھے کیونکہ اُن کے دُوسری طرف مغربی ایشیا کی بڑی زبردست سلطنتیں تھیں۔

[1] CELSUS.

یہ سلطنتیں دجلہ اور فرات کی تھیں۔ فلسطین کی سلطنت بڑی ہی حقیر تھی۔ اُس کی کیا بساط کہ ان دونوں سلطنتوں کے درمیان اطمینان کا سانس لے سکتی۔ اگر یہ دونوں سلطنتیں ایک دُوسرے سے برسرِپیکار ہوتیں تو فلسطین کی سلطنت پائمال ہو جاتی۔ تمام نبیوں نے اس تباہی و بربادی کی پیشین گوئی کی ہے اور آخرکار یہُودی قوم اسیر ہوکر بابل چلی گئی۔ مصر کی غلامی کے بعد بابل کی اسیری کی آفت نازل ہُوئی کیونکہ یہ قوم شاہراہ پر بستی تھی۔ ان تمام باتوں میں خُدا کا ایک خاص مقصد تھا۔ تمام نبیوں نے اس مقصد کو دیکھا تھا۔ ایسا معلُوم ہوتا تھا کہ افریقہ اور ایشیا کی بڑی بڑی طاقتوں کی کشمکش ناکافی تھی۔ نئے عہدنامہ کے پیشتر کے زمانہ سے ہی یورپ کی طاقتیں بھی اس کشمکش میں شامل ہو جاتی ہیں۔ سکندرِ اعظم نے ہندوستان کی طرف لشکرکشی کی اور ۳۳۲ ق۔م میں اُس نے اس شاہراہ پر قبضہ جمالیا۔ پھر ۶۳ ق م میں رُومیوں کا دَوردورہ ہُوا۔

خُداوند مسیح کے زمانہ تک تینوں برّاعظموں (شمالی افریقہ۔ مغربی ایشیا اور جنوبی یورپ) کی آپس کی لڑائیاں صرف اسی شاہراہ کی خاطر ہُوئیں۔ اسی سے فلسطین کی جنگی اہمیّت واضح ہوتی ہے۔ نئے عہدنامہ کے زمانہ میں تصویر بالکل بدل جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مسیحیت یروشلیم سے شرُوع ہوتی ہے۔ اب تیروں کے نشان دیکھئے کہ اُن کا رُخ اب اس شاہراہ کی طرف نہیں ہے۔ اب اُن کا رُخ تین اطراف کو ہے یعنی ایشیا

افریقہ اور یورپ کی طرف، اور یہ تیز ایک عالمگیر مذہب کی ترقی کو ظاہر کرتے ہیں۔

اُس زمانے میں مشرقی بحیرہ رُوم میں اس قسم کی ترقی کے کیا مواقع تھے؟ مقدس پولس رسول نے فرمایا ہے کہ خداوند یسوع مسیح اُس وقت پیدا ہُوا "جب وقت پُورا ہو گیا۔" (گلتیوں ۴:۴)۔

مرقس رسول خداوند یسوع مسیح کی مُنادی کے متعلق یُوں کہتا ہے "وقت پُورا ہو گیا ہے" (مرقس ۱:۱۵) ہر ایک چیز تیار تھی۔ اب موقع تھا۔ آیئے دیکھئے کہ اُس زمانہ میں مواصلات اور سلسلۂ رسل و رسائل کا کیا حال تھا۔ ہمیں دو علاقوں کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اوّل۔ بحیرہ رُوم کے اِرد گرد کا بری علاقہ جہاں دُنیا کی بہترین شاہراہیں تھیں۔ اور خشکی کے راستے ہر لحاظ سے محفوظ تھے۔ دوم۔ بحر ہند جہاں جہازران سمندر کے چپے چپے سے واقف تھے اور وہ سمندر میں دُور دُور تک سفر کیا کرتے تھے۔ مسیحی عالم اوریجن نے جو ۱۸۵ء میں سکندریہ میں پیدا ہُوا، رُومی سلطنت اور اسی سلطنت سے جو خدا کا مقصد تھا اُس کے متعلق یُوں لکھا ہے:۔

"خداوند نے فرمایا، جاؤ اور ساری قوموں کو شاگرد بناؤ۔ اب یہ بات یقینی ہے کہ خداوند یسوع قیصر اوگستس (۳۱ ق م تا ۱۴ ق م) کے عہد میں پیدا ہُوا۔ اس شہنشاہ کی سلطنت میں دُنیا کی بہت سی قومیں آباد تھیں۔ اگر بہت سی سلطنتیں ہوتیں تو بادشاہ اپنی اپنی سلطنت کو توسیع کرنے کی غرض سے دُوسری سلطنتوں سے جنگ و جدل

میں مشغول رہتے اور اس طرح سے ساری دُنیا میں خداوند یسوع کے کلام کے پھیلنے میں رکاوٹ ہوتی۔"

مقدس پولس رسول کے زمانہ سے اوریجن کی پیدائش تک بحیرہ رُوم کی سرزمین میں ایک بادشاہ کے ماتحت ہونے کی وجہ سے امن و امان رہا۔ نہ ہی صرف سلطنت رُومہ میں امن تھا بلکہ رُومی سڑکیں اور شاہراہیں بھی پُر امن تھیں۔ یہ شاہراہیں محض چھوٹے چھوٹے راستے اور پگڈنڈیاں نہ تھیں، بلکہ یہ سڑکیں باقاعدہ تعمیر کی گئی تھیں اور پختہ تھیں اور اُن پر میلوں کے نشان لگے ہُوئے تھے۔ اگر آپ ان سڑکوں پر سفر کرتے چلے جائیں تو آخر کار آپ شہر رُومہ کے چوک میں پہنچ جائیں گے، جہاں "سنہری میل کا نشان" لگا ہُوا تھا۔ یہ نشان سونے کا ایک مینار تھا اور اس پر سڑکوں کے نام لکھے ہُوئے تھے۔ سلطنت کے جن بڑے بڑے شہروں سے یہ سڑکیں آتی تھیں اُن کے نام بھی لکھے ہُوئے تھے۔ ان سڑکوں پر مسافر بلا خوف و خطر سفر کرتے تھے۔ اُن کے جان و مال کو کسی قسم کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ اس سے پیشتر مسافروں کو کبھی اتنی سہولتیں میسر نہ ہُوئی تھیں۔ اُنیسویں صدی میں جب تک ریلوں کا اجراء نہ ہُوا سفر میں رُومیوں کے زمانے کی سی سہولتیں میسر نہ ہُوئیں اور نہ ہی مسافروں کا مال اور جان محفوظ تھے۔ مقدس پولس رسول کے زمانے میں گاڑیوں، گھوڑوں، خچروں یا گدھوں کے ذریعہ سفر کیا جاتا تھا لیکن

ایک دن میں اگر ستّر یا سو میل کی مسافت طے کرلی جائے تو کافی
تھا۔ آج کل کی سی تیز رفتاری مفقود تھی۔ لیکن اس میں کوئی شک
نہیں ہے کہ اگر کوئی گدھا ستّر میل کا سفر طے کرلیتا تو یہ بڑی بات
سمجھی جاتی تھی۔

بحری سفر میں نہ سہولتیں تھیں اور نہ ہی آرام تھا۔ اُس زمانہ میں اگر
کوئی جہاز دو سو فٹ لمبا ہوتا تو اُسے کافی بڑا خیال کیا جاتا تھا۔ اس
جہاز میں جس میں مقدس پولس رسول سفر کر رہا تھا اُس میں دو سو چھہتّر
آدمی سوار تھے یا صرف چھہتّر مسافر تھے؟ (اعمال ۲۷: ۳۷) مقدس
پولس رسول کا ہمعصر یوسیفس[1] بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ جہاز
کے چھ سو مسافروں میں سے ایک تھا۔ اُسی زمانے میں عام رواج یہ
تھا کہ جہازوں کو نومبر سے مارچ تک بندرگاہ ہی پر رہنے دیا جاتا
تھا کیونکہ موسم سرما میں طوفانوں کا بڑا خطرہ رہتا تھا، چاروں طرف
سے خشکی سے گھرے ہوئے اس مغربی سمندر بحرِ ہند کے جہازرانوں کی
نسبت بہت کم سفر کیا کرتے تھے کیونکہ اُن کے وسائل محدود تھے لہذا
ہم اس کے متعلق اب بیان کریں گے۔

اگر مشرقی بحیرہ روم سے بحرِ ہند تک بحری سفر کیا جائے تو دریائے
فرات اور خلیج فارس کو عبور کرنا پڑتا ہے یا فلسطین سے ہو کر خلیج
عقبہ[2] اور بحیرہ قلزم کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ اگر مصر کی بندرگاہ سکندریہ
سے روانہ ہوں تو دریائے نیل کے اوپر کی طرف کوئی پانچ سو میل

[1] JOSEPHUS [2] AKABA.

کوپٹوس[1] تک کشتی میں جانا پڑتا تھا۔ اس کے بعد ایک ہفتہ کا صحرا کا
سفر تھا۔ اس کے بعد موصل[2] کی بندرگاہ تک پہنچتے تھے۔ یہ بندرگاہ
بحیرہ قلزم کے ساحل پر واقع تھی (ملاحظہ ہو نقشہ ۲) خداوند یسوع
مسیح کے رسولوں کے تین ہمعصر یونانی مصنّفوں نے اس زمانے میں
بحرِ ہند کے اس علاقے میں تجارت میں روزافزوں ترقی کا حال لکھا ہے۔

ان میں سے ایک مصنّف نے ایک کتاب "بحری سفر" لکھی ہے
یہ کتاب بحرِ ہند کا گائیڈ ہے۔ وہ اپنی اس کتاب میں سندھ کے
قریب ہندوستان، عرب اور یونان کی جہازرانی کے متعلق تحریر کرتا
ہے۔ ہندوستانیوں نے بھڑوچ (بمبئی کے شمال میں) کی بندرگاہ میں
سامان کا ذخیرہ اکٹھا کرلیا اور بحیرہ قلزم کے دہانے سے افریقہ کے
ساحل پر زنجبار تک تجارت کیا کرتے تھے۔ عربوں نے عدن کے
مغرب میں موشا کو اپنا اڈا بنالیا۔

"اس مقام پر جہازوں کے مالکان عربوں کی بہت بڑی تعداد
ہے۔ جہازران بھی بے شمار ہیں۔ تمام لوگ اپنے اپنے کاروبار میں
مشغول رہتے ہیں۔ وہ افریقہ کے ساحلی علاقوں اور شمال مغربی
ہندوستان کے ساتھ تجارت کرتے ہیں۔ وہ ان مقامات پر اپنے
جہاز بھیجتے ہیں۔"

یونانی موصل کی بندرگاہ سے بحیرہ قلزم کے دونوں ساحلوں
کے علاقوں میں تجارتی جہاز لے جایا کرتے تھے۔ وہاں سے

[1] CEPTOS [2] MOCHA

وہ جنوب کی طرف زنجبار کی طرف یا شمال کی طرف خلیج فارس سے گزر کر ہندوستان اور لنکا جایا کرتے تھے۔ یہ مصنّف جنوب مغربی ہواؤں کا ذکر کرتا ہے جو جون سے ستمبر تک طوفان اور بارش لاتی ہیں۔ وہ یونانی جہازران جو ساحل کے قریب رہتے تھے وہ اس سے پیشتر اس موسم میں تجارت کی غرض سے اِدھر اُدھر نہیں جایا کرتے تھے یعنی یہ بند موسم تھا لیکن غالباً اب انہوں نے ہندوستانیوں اور عربوں کی تقلید کی اور وہ طوفانوں میں بھی سمندروں میں جہاز رانی کیا کرتے تھے اور ہوائیں اُن کے جہازوں کو خشکی سے دُور دُور تک سمندر میں لے جاتی تھیں اور وہ بھڑوچ اور کرانگانور (نقشہ ۱) پہنچ جاتے تھے۔ مون سون ہوائیں بحیرۂ عرب میں جہازوں کے لئے بڑی خطرناک ہوتی تھیں۔ یہ موسم جہازوں کے لئے بڑا ہی ناسازگار ہوتا تھا لیکن ان ہواؤں سے ایک فائدہ ضرور ہوتا تھا کہ جہازوں کی رفتار تیز ہو جاتی تھی۔ سکندریہ سے سوداگر ہندوستان آ کر یہاں سے کالی مرچ، مصالحہ جات، عطریات، ململ، موتی، ہاتھی دانت، کچھوؤں کے رنگ برنگ کے خول اور چاندی خرید کر صرف چھ مہینوں میں اپنے وطن واپس جا سکتے تھے۔

ایک اور مصنّف نے تجارت کی روز افزوں ترقّی کے متعلق بیان کیا ہے۔ اس کا نام سٹرابو[1] تھا جو ۲۵ء میں فوت ہوا۔ وہ رقمطراز ہے:۔

[1] STRABO.

"اس سے پیشتر سال میں بیس۲۰ جہازوں سے زیادہ خلیج عرب کو عبور کرنے کی جرأت نہیں کیا کرتے تھے کیونکہ سفر بڑا ہی پُرخطر تھا لیکن اب جہازوں کے بیڑے ہندوستان اور افریقہ تک جاتے ہیں اور وہ ان علاقوں سے بڑی قیمتی اشیا مصر میں لاتے ہیں۔"

تیسرا مصنّف پلینی ایلڈر[1] ہے۔ اُس نے اپنی کتاب نیچرل ہسٹری[2] سنہ ء کے قریب لکھی۔ اُس نے اس امر کی شکایت کی ہے کہ مشرقی ممالک کے یہ جہاز سامانِ تعیّش کی تجارت کرتے ہیں اور اس طرح سے رومی سلطنت میں ایک سال میں تقریباً ایک ارب سیسٹرسز[3] رومی سکّے کا مال فروخت کرتے ہیں اور یوں روم کی دولت دوسرے ممالک میں جا رہی ہے۔ ہمیں اس رقمِ خطیر کا اپنے مُلک کے سکّے میں تبدیل کر کے لاگت کا اندازہ لگانا چاہیئے۔ یہ یاد رہے کہ ایک دینار چار سیسٹرسز کے برابر ہوتا ہے اور متّی رسول کی انجیل ۲۰: ۲ کے مطابق خداوند یسوع مسیح کے زمانہ میں ایک مزدور کی یومیہ مزدوری ایک دینار تھی۔

قدیم زمانے کے ان جہازرانوں کے سامنے ایک وسیع و عریض دُنیا تھی۔ آئیے! اُس وقت کی دُنیا کی حدود معیّن کر لیں۔ "بحری سفر" کا مصنّف جب زنجبار کے جنوب کا حال لکھتا ہے تو کہتا ہے "وہ سمندر جس کا حال ابھی تک دریافت نہیں کیا گیا وہ مغرب کی طرف ایک قوس کی صورت میں پھیلا ہوا ہے۔ واسکوڈی گاما[4] کے

[1] PLINY ELDER [2] NATURAL HISTORY [3] SESTERCES.
[4] VASCO DE GAMA.

آنے تک جہازرانوں کو افریقہ کے متعلق بس اتنا ہی علم تھا۔ یہ پرتگیزی جہازران سنہ ۱۴۹۷ء میں اس سمندر میں آیا (نقشہ ملاحظہ فرمائیے) "بحری سفر" کا یہ مصنف دریائے گنگا کے دہانے کا ذکر کرنے کے بعد ہندوستان کے مشرقی ساحل پر اور ملایا کے دور مشرق کی طرف کسی جگہ چین کے بارے میں کہتا ہے: "اس ملک میں جانا آسان نہیں ہے۔ اس ملک سے شاذونادر ہی کبھی کوئی شخص آتا ہے"۔ لیکن چین کی سلطنت جو رومی سلطنت کی طرح عظیم اور مہذب تھی اور اس سے زیادہ قدیم بھی تھی، رومیوں کے ساتھ اس کے تجارتی تعلقات تھے چھٹی صدی مسیحی تک روئے زمین پر صرف اہل چین ہی ریشم کے کیڑوں سے ریشم حاصل کیا کرتے تھے اور خداوند یسوع مسیح کے زمانے سے پیشتر بھی سلطنت روما کی امیر خواتین ریشم منگوایا کرتی تھیں۔ تھوڑی سی مقدار میں ریشم ہمالیہ کے اس طرف بھی لایا جاتا اور ہندوستان کی بندرگاہوں سے مغربی ممالک کی طرف جہازوں کے ذریعہ بھیجا جاتا تھا۔ لیکن ریشم کی زیادہ مقدار خشکی کے راستے خلیج فارس تک پہنچائی جاتی تھی اور اس کی تجارت سے پارتھیا کے لوگ خوب ہاتھ رنگتے تھے۔ چین کے ملک کی سرکاری تاریخ کا بیان ہان[1] خاندان کی بعد کی تاریخ میں یوں مندرج ہے کہ سنہ ۱۶۶ء میں "شاہ این ٹن[2]" کے ملک سے چین کے دارالحکومت میں ایک تجارتی وفد آیا۔ "شاہ این ٹن" سے مراد رومی شہنشاہ مارکس آریلیس انٹونینس ہے۔

---

[1] HISTORY OF THE LATER HON DYNASTY.

[2] THE KING AN-TUN.

اس رومی وفد کا یہ مقصد تھا کہ انہیں براہ راست سستے نرخوں پر ریشم ملا کرے۔ چین کی تاریخ میں مرقوم ہے۔ "اس وقت سے اس ملک کے ساتھ براہ راست تجارتی تعلقات شروع ہو گئے"۔

پس مقدس پولس رسول اور مقدس پطرس رسول کی شہادت، (روایت کے مطابق وہ سنہ ۶۴ء میں شہید ہوئے) کے ایک صدی بعد بحیرہ روم کے مشرقی علاقے (جہاں سے مسیحیت دوسرے ممالک میں پھیل رہی تھی) اور بحیرہ چین کے درمیان مواصلات کا سلسلہ شروع تھا۔ خدا اور دنیا کے متعلق مسیحی مذہب کے مرکزی عقائد مندرجہ ذیل ہیں:-

"خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے"۔

"تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور ان کو باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو"۔

چنانچہ اس سے پیشتر کسی زمانے میں آدمیوں کے سامنے اتنی وسیع و عریض دنیا نہ تھی۔

دوسرا باب

تین برّاعظموں میں پیش قدمی

سنہ ۲۹ء تا سنہ ۵۰۰ء

رسولوں کے اعمال کی کتاب میں مقدس لوقا رسول "یروشلیم سے شروع" کرتا ہے (پہلے پانچ باب) وہ بشارت میں وسعت کے متعلق بیان کرتا ہے۔ اس میں سامری اور غیر اقوام بھی شامل ہیں (باب ۶ تا ۱۲) پھر انطاکیہ سے غیر قوموں میں منادی کرنے کی تحریک شروع ہوتی ہے (باب ۱۳ تا ۲۸) وہ اعمال کی کتاب کا اُس وقت سے اختتام کرتا ہے جب غیر قوموں کا رسول (پولس رسول) روما میں پہنچتا ہے۔ مصنف اس کتاب کی کہانی میں اُس وقت ظاہر ہوتا ہے جب پولس رسول یورپ میں جاتا ہے (۱۶: ۱۰ سے آگے مصنف "وہ" کی بجائے "ہم" کا لفظ استعمال کرتا ہے) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ مکدنی آدمی (اعمال ۱۶: ۹) جس کی رویا پولس رسول نے دیکھی تھی خود لوقا ہی تھا۔ وہ فلپی میں ڈاکٹر یا طبیب تھا اور جب پولس رسول تروآس میں بیمار تھا تو اُسے یہاں بلایا گیا تھا (اعمال ۱۶: ۷، ۸ کا مطلب؟) اور اس کے ساتھ یورپ میں انجیل کی بشارت کے متعلق گفتگو ہوئی

ہوگی۔ مقدس صحیفوں کے مصنفین میں سے صرف لوقا رسول ہی ایشیائی یہودی نہیں ہے۔ یہی وہ شخص ہے جو یورپین رسم و رواج میں چلا تھا۔

اعمال کی کتاب کا آغاز جو مسیحی کلیسیا کی اوّلین تواریخ ہے، ایشیا میں ہوا لیکن اس میں مسیحیت کے مغربی ممالک میں پھیلنے کی روئداد ہے، لیکن مقدس لوقا رسول کبھی کبھی مسیحیت کے مشرق کی طرف یعنی ایشیا میں دور تک اور جنوب میں افریقہ میں پھیلنے کا اشارہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پنتکست کے دن یروشلیم میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو دریائے دجلہ کے مشرق سے (اعمال ۲: ۹) اور شمالی افریقہ سے آئے تھے۔ وہ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ یہودی اور اُن کے مریدان "تین ہزار" میں پیش پیش تھے اور شاگردوں میں اُسی روز "تین ہزار آدمیوں کے قریب مل گئے" (اعمال ۲: ۳۹، ۴۱) وہ چاہتا ہے کہ ہم خود یہ تصور کریں کہ جب وہ اپنے اپنے گھروں کو واپس آئے تو کیا واقعہ ہوا۔ وہ حبشی خوجہ بپتسمہ لینے کے بعد "خوشی کرتا ہوا اپنی راہ چلا گیا" وہ سوڈان میں میروؔ کا رہنے والا تھا اور اُسے دریائے نیل کے ساتھ ساتھ ایک ہزار میل کا سفر کرنا تھا۔ اس صاحب اختیار شخص نے انجیل کی بشارت میں کیا حصہ لیا؟

ہم انجیل مقدس کو ایک علیحدہ کتاب خیال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں لیکن رسولوں کے زمانے اور بعد کی تواریخ کلیسیا کے درمیان رشتہ ٹوٹا ہوا نہیں ہے۔ نئے عہدنامے کے زمانہ کے

ؔ MAROO.

حالات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہُوئی اور اگر کوئی تبدیلی ہوتی بھی ہے تو رفتہ رفتہ۔ اس کی ایک مثال ایسے عبادت خانے ہیں جو گھروں میں تھے۔ مُقدّس لُوقا رسُول لکھتا ہے کہ خُداوند یسُوع مسیح کے آسمان پر چلے جانے کے بعد یروشلیم کے ایک گھر کے بالاخانے میں ایک سو بیس مسیحی اکٹھے ہُوئے (اعمال ۱: ۱۳-۱۵) غالباً یہی وہ گھر تھا جہاں خُداوند یسُوع مسیح نے اپنے شاگردوں کے ساتھ آخری فسح کھائی (لُوقا ۲۲: ۱۳) رسُولوں کے اعمال کی کتاب اور خطُوط میں جن کلیسیاؤں کا ذکر ہے وہ "اسی قسم کے گھروں میں ہوتی تھیں" (رُومیوں ۱۶: ۵)۔

دُوسری صدی مسیحی تک مسیحی عبادتیں عام طور پر کسی نہ کسی آدمی کے گھر میں ہوا کرتی تھیں۔ وہ لوگ کسی ایسے گھر کا انتخاب کرتے تھے جس میں کافی بڑا کمرہ ہوتا تھا اور اُس میں کسی شخص کی خلل اندازی کا کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا اور اگر کسی قسم کا کوئی خطرہ ہوتا تو خطرے کے ایام میں یہ مقام خُفیہ رکھا جاتا تھا اور صرف قابلِ اعتماد دوستوں کو ہی اس کا علم ہوتا تھا۔ دُوسری صدی مسیحی کے بعد ہم ایسی جگہوں کے متعلق سُنتے ہیں کہ جہاں کوئی چھوٹی سی عمارت ہوتی تو اسے "خُداوند کا گھر" کہا جاتا تھا۔ پھر ۲۶۱ء میں رُومی سلطنت میں مسیحیت کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا جانے لگا اور بعض شہروں میں مسیحیوں نے عبادت خانے بنانے کی جُرأت کی۔ یہ عبادت خانہ مستطیل شکل کا

ایک ہال ہوتا تھا جس کا مشرقی حصّہ گول ہوتا تھا اور وہاں خُداوند کی میز رکھی جاتی تھی۔ سلطنتِ رُومہ میں جب ۳۰۳ء میں ایذا رسانیوں کا دَور شروع ہُوا تو مسیحیت کے دشمنوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ یا تو اس قسم کے عبادت خانوں کو گرا دیا یا اُنہیں نذرِ آتش کر دیا۔ ۳۱۲ء کے بعد رُومی سلطنت میں ایذا رسانی کا خُونین دَور ختم ہُوا اور کلیسیا کی جائداد میں اضافہ ہونا شروع ہُوا۔

مسیحیت کے پھیلنے کے کیا وسائل تھے؟

اس ضمن میں چار چھوٹی چھوٹی تصاویر ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ یہ تصاویر کتنی نئے عہدنامہ کی رُوح کے مطابق ہیں۔ اوّل۔ تمام وقتی مشنری تھے جنہیں بعض اوقات "رسُولوں کے جانشین" کہا جاتا تھا۔ ۲۵۰ء کے قریب اوریجن نے جو شمالی مشرقی افریقہ اور مغربی ایشیا سے اچھی طرح سے واقف تھا، لکھا ہے:۔

"مسیحی حتی المقدور ساری دُنیا میں انجیل کا پیغام پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے مشنری سفر کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے اور نہ ہی صرف شہروں میں مُنادی کی خاطر جاتے ہیں بلکہ وہ دُور اُفتادہ گاؤں اور چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں میں بھی کلام کی مُنادی کرتے ہیں اور خُداوند کی خاطر رُوحوں کو جیتتے ہیں اور لوگ خوشی خوشی خوشخبری کے ان پیامبروں کی تواضع کرتے ہیں۔"

دوم :- ہمارے سامنے عام شُرکائے کلیسیا کی گواہی ہے۔ اِن میں سے کچھ بڑے ہی حلیم الطبع لوگ تھے۔ ایک غیر مسیحی غلاموں کے متعلق رقمطراز ہے کہ اُنہوں نے تمام گھرانے کو مسیحی بنادیا۔ یہ ۱۸۰ء کا واقعہ ہے اور مقام سکندریہ یا رُوم ہے :-

"پرائیوٹ گھروں میں جُلاہے، موچی، دھوبی اور ناخواندہ اور گنوار لوگ ہیں۔ انہیں اپنے بزرگوں یا نسبتاً دانا آقاؤں کے سامنے بات کرنے کی جُرأت نہیں ہوتی لیکن وُہ بچّوں اور اپنے جیسی جاہل عورتوں سے باتیں کرنا شروع کرتے ہیں اور اُن سے کہتے ہیں کہ صرف ہمیں ہی رہنے سہنے کا سلیقہ ہے۔ تم جو بچّے ہو اگر ہماری باتوں پہ عمل کرو گے تو تم خود بھی خوش رہو گے اور اپنے گھروں کو بھی خوشی سے بھر دو گے۔ اپنی اس گفتگو کے دوران وُہ ایک اُستاد کو یا باپ کو اپنی طرف دیکھتے ہیں۔ پس وُہ سرگوشی میں کہتے ہیں :-

"اب اِن کے سامنے ہم کچھ نہیں کر سکتے لیکن تم اِن عورتوں اور اپنے ہم جولیوں کے ساتھ عورتوں کے کوارٹرز میں موچی کی دُکان یا دھوبی کی لانڈری پہ آجانا اور وہاں تمہیں سب کچھ بتادیا جائے گا۔"

اس قسم کی باتوں سے وُہ اُنہیں خُداوند مسیح کے لئے جیت لیا کرتے تھے۔

سوم :- پھر مسیحی نمونے کا اثر ملاحظہ کیجئے۔ جسٹن فلسطین میں پیدا ہُوا۔ افسس میں مسیحی ہُوا اور ۱۵۰ء کے قریب رُوم میں مُناد تھا وُہ

یُوں لکھتا ہے :-

ہمارے خُداوند نے ہمیں حُکم دیا ہے کہ ہم صبر اور حلیمی سے تمام لوگوں کو لعنت اور نفسانی خواہشات سے بچائیں اور وُہ لوگ جن کو ہم سے واسطہ پڑتا ہے ہم اُنہیں مسیحی نمونہ دکھا سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے مسیحی ہمسایوں کی زندگی کو دیکھا یا اُنہوں نے مسیحی مُسافروں کے صبر کا امتحان کیا جب سرائے میں یا چُنگی خانہ میں اُن سے زیادہ رقم وصُول کی گئی یا اُن لوگوں نے مسیحیوں کے ساتھ مِل جُل کر کام کیا تو اُن کی گھناؤنی زندگیاں یکسر تبدیل ہوگئیں اور اُن کے کردار میں نمایاں فرق پیدا ہوگیا۔

چہارم :- ہمیں شہیدوں کا بھی ذکر کرنا چاہیئے۔ شہید کا مفہوم ہے شہادت دینے والا یا گواہ یعنی وُہ انسان جو اپنے ایمان کی خاطر دُکھ اُٹھانے اور مرنے کو تیار تھے۔ وُہ اُن سب کے لئے جو اُنہیں دیکھتے تھے ایک چیلنج تھے۔ شمالی افریقہ کے کارتھیج کے طرطلین نے ۱۹۷ء کے قریب یہ الفاظ لکھے تھے :-

"جتنا زیادہ آپ ہمیں قتل کرتے ہیں ہماری تعداد میں اُتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مسیحیوں کا خُون ہی بیج ہے۔ آپ کے بہت سے مشہور ادیبوں نے بھی یہی تعلیم دی ہے کہ مصائب اور موت کو بڑی بہادری سے برداشت کرنا چاہیئے لیکن لوگ اِن ادیبوں کے اس طرح سے شاگرد نہیں ہوتے جیسے مسیحیوں کے ہوتے ہیں۔ گفتار کے اُستادوں کی

ضرورت نہیں بلکہ کردار کے اُستادوں کی ضرورت ہے"۔

طرطلین خود اسی طرح مشرف بہ مسیحیت ہُوا تھا۔ اِن تصویروں کو اپنے ذہن میں رکھ کر ہم باری باری تینوں بڑا اعظموں کا جائزہ لیں گے۔

ایشیا: مسیحیوں نے کسی وقت بھی اس بات کو نہیں بھُلایا کہ اُن کا مذہب یروشلیم سے شروع ہُوا تھا۔ دُوسری اور تیسری صدی میں وُہ ارضِ مُقدسہ کو جانتے تھے اور اِن مقامات کی زیارت بھی کیا کرتے تھے۔ شہنشاہ کانسٹنٹائن کی والدہ محترمہ ہیلن نے ۳۲۶ء میں مذکورہ مقاماتِ مُقدسہ کی زیارت کی اور ۳۸۵ء میں جیروم بھی زائرین کی ایک جماعت کے ہمراہ اِن مقامات کی زیارت کے لئے آیا۔ اس جماعت میں عالی وقار خواتین بھی شامل تھیں۔ یہ لوگ نہ صرف مقاماتِ مُقدسہ کی زیارت کے لئے آئے تھے بلکہ وُہ بیت لحم میں اُس گرجا کے قریب جہاں خُداوند یسُوع مسیح پیدا ہُوا تھا راہب اور راہبات بن کر زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔

نئے عہدنامہ کے زمانہ میں فلسطین سے دُور سیریا کے انطاکیہ کی غیر یہُودی کلیسیا قیادت کی ذمہ داری اُٹھانے لگی تھی۔ اسی جگہ لوگ شاگردوں کو پہلی مرتبہ "مسیحی" کہنے لگے (اعمال ۱۱: ۲۶)۔ اسی مقام سے مغرب کی طرف مسیحیت پھیلنے لگی (اعمال ۱۳: ۱-۳)۔ انطاکیہ مشرق کا عظیم اُسقفی حلقہ کہلایا جانے لگا۔ دُوسرے عظیم اُسقفی حلقے یہ تھے۔

جنُوب میں اسکندریہ اور مغرب میں رُوم اور یروشلیم کو بھی روایات کی وجہ سے شامل کر لیا گیا اور پانچواں اُسقفی حلقہ قسطنطنیہ ہے۔ اس مقام کو ۳۳۰ء میں نیا مسیحی دارالسلطنت قرار دیا گیا۔ اس کے بعد لوگ اِن پانچوں بشپوں کو "بزُرگ" یا "سردارِ کلیسیا" کہنے لگے۔

انطاکیہ سے جس مشنری کام کا آغاز ہُوا، اس میں سب سے زیادہ کامیابی ایشیائے کوچک میں ہُوئی۔ اس مقام کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ نئے عہدنامے کی ۲۷ کتابوں میں سے تقریباً نصف یا تو اسی جگہ لکھی گئی ہیں یا اس جگہ کی کلیسیاؤں کے نام خطوط کی صُورت میں تحریر کی گئی ہیں۔ ایشیائے کوچک قدیم زمانے سے ہی ایسا خطّہ چلا آیا ہے جہاں مسیحیوں کی تعداد بہُت زیادہ تھی۔ پلینی[۱] کوچک اُس پلینی کا بھتیجا تھا جس کا اس کتاب کے صفحہ ۸ پر ذکر آیا ہے۔ اُس نے ۱۱۲ء میں شہنشاہ ٹراجن کو بتُونیہ کے گورنر کی حیثیت سے خط لکھا کہ وُہ اس مذہب کے پیروکاروں کی بڑھتی ہُوئی تعداد کے ساتھ کیا کرے۔

"مرد اور عورتیں جوق در جوق یہ مذہب اختیار کر رہے ہیں۔ بُت خانوں کی رونق ختم ہو رہی ہے اور مندر سُونے پڑے ہیں اور حالات اسی قسم کے رہیں گے"۔

حقیقت یہ ہے کہ ایذا رسانی کے باوجُود بھی حالات اسی قسم کے رہے۔ بتُونیہ کے مشرق میں پنطس کے شہر میں ماس موومنٹ[۲] کا

---

[۱] THE YOUNGER PLINY.   [۲] MASS MOVEMENT.

آغاز ہوا۔ بشپ گریگوری اس تحریک کے رُوح و رواں تھے۔ اُنہیں "معجزنما" کہا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب اُنہوں نے اپنا کام شروع کیا تو اُس وقت اُن کے شہر جدید قیصریہ میں صرف سترہ مسیحی تھے۔ اور جب ۲۷۰ء میں وُہ خُداوند میں سو گئے تو اُس شہر میں صرف سترہ غیر مسیحی رہ گئے تھے۔ اس کے بعد ایک بشپ نے جس کا خاندان پنطس سے آیا تھا گریگوری کے طریق کار کے متعلق یُوں لکھا ہے:۔

"صبح سویرے لوگوں کا ایک جم غفیر اُن کے دروازے پر جمع ہو جاتا تھا۔ اِن میں عمر رسیدہ لوگ، حاجتمند اور ایسے لوگ شامل ہوتے تھے جن میں بدرُوحیں ہوتی تھیں اور بشپ موصُوف خوشخبری کی مُنادی کرتے، لوگوں سے استفسار کرتے، اُنہیں نصیحت کرتے، تعلیم دیتے اور شفا دینے کا کام کیا کرتے تھے اور اسی طرح لوگ انجیل کے پیغام کو سُننے کے لئے آیا کرتے کیونکہ وُہ خُدا کی قُوّت کو دیکھتے بھی تھے اور اُس کے متعلق سُنا بھی کرتے تھے۔"

۳۸۰ء کے قریب ہی مُصنّف ایشیائے کوچک کے اپنے علاقے کپدکیہ کے متعلق رقمطراز ہے:۔

"اتنی تعداد میں الطار تو ساری دُنیا میں مُشکل سے ہی ملیں گے۔ انطاکیہ کی کلیسیا جس نے پولُس رسُول اور برنباس کو مغرب کی طرف روانہ کیا وُہی کلیسیا ۱۶۰ میل دُور مشرق کی طرف سلطنت رومہ کی حدُود سے پرے اڈیسہ (آج کل عرفہ) کے شہر میں خوشخبری کا

پیغام پھیلانے کی ذمہ دار تھی۔ ابتدائی ایام کی روایت میں ایک خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو قیاس کیا جاتا ہے کہ اڈیسہ کے بادشاہ نے ہمارے خُداوند کو لکھا ہے۔

"یہُودی آپ کے خلاف بڑبڑاتے ہیں اور آپ کو ضرر پہنچانا چاہتے ہیں۔ میرا شہر چھوٹا ہے مگر بڑا خوبصُورت ہے اور ہم دونوں کے لئے کافی ہے۔"

ایسا معلُوم ہوتا ہے کہ اس خط کا اقتباس پیش کرنے میں اس واقعہ کو جو درحقیقت تقریباً دُوسری صدی میں ہُوا اُس سے بہت پہلے رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بادشاہ نے مسیحیت قبُول کر لی اور اڈیسہ پہلی ریاست تھی جس نے مسیحیت کو ریاست کا مذہب قرار دیا۔ اڈیسہ ذیل کی دو اور باتوں پر ناز کر سکتا ہے جنہیں مُقدّم کہا جا سکتا ہے۔

اوّل:۔ سب سے پہلے اسی جگہ ایک گرجا تعمیر ہُوا (یہ گرجا ۲۰۱ء میں ایک سیلاب سے تباہ ہو گیا)۔

دوم:۔ انجیل کا اصل یُونانی سے پہلا ترجمہ اسی جگہ پر کیا گیا۔ ططیان[1] کی کتاب چاروں انجیلوں میں ہم آہنگی (۱۶۰ء) اڈیسہ نے مسیحی سریانی لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اس لٹریچر میں طبع زاد کتابیں اور ترجمے بھی ہیں۔ اس کلیسیا کے پاس بائبل تھی وُہ عشائے ربانی کی رسم ادا کیا کرتی تھی نیز اس کلیسیا کے پاس اس زبان میں ایسا ادب تھا جو ایشیا میں مشرقی علاقوں کی طرف پھیل رہا تھا۔

[1] TATIAN.

مغرب میں ایشیائے کوچک اور جنوب میں ایڈیسہ[ط] کی مسیحیت کے اثرات آرمینیا میں بھی ظاہر ہونے لگے۔ ایک دُوسرے گریگوری کی سرکردگی میں اِس مقام پر بھی ماس مُووَمنٹ شروع ہُوئی۔ مذکورہ گریگوری کو "روشن خیال" کہا جاتا تھا۔ آرمینیا کے ایک معزز خاندان کا چشم وچراغ تھا۔ کپدکیہ میں اُس کی ایک مُنہ بولی ماں رہتی تھی جس کی وجہ سے اُس نے مسیحیت اختیار کی۔ آرمینیا فارسیوں کی غُلامی سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اِس لئے فارس کے مشرق میں کوئی مذہبی تبدیلی نظر نہیں آتی، بلکہ اِس کے لئے کسی دُوسری طرف رجُوع کرنا چاہیئے۔ اب گریگوری کے لئے موقع پیدا ہُوا اور اُسے جیل کی سختیاں جھیلنی پڑیں اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُس کی جان کے لالے پڑ گئے لیکن سنہ ۳۰۱ء تک اُس نے آرمینیا کے بادشاہ کو خُداوند یسُوع مسیح کے لئے جیت لیا۔ اُس وقت آرمینیا پہلی قوم تھی جس نے مسیحیت کو مُلکی مذہب قرار دیا (ایڈیسہ ایک شہر تھا) اور بُتوں کو توڑ دیا گیا اور کئی پُجاریوں نے اس نئے مذہب کو قبُول کر کے بشارت کی خدمت انجام دینا شروع کر دیا۔ دریائے دجلہ اور فرات کے زیریں علاقوں میں اور بحیرہ کیسپئین کے مشرق میں ایڈیسہ کی یہ مسیحیت جس کی زبان سُریانی تھی، پھیلنے لگی۔ سنہ ۲۲۵ء تک بیس سے زیادہ اُسقفی حلقے قائم ہو چُکے تھے۔ اس سال تک فارسیوں (ساسانی) کی سلطنت بحال ہو چُکی تھی۔ سلطنت کا مذہب زرتشت تھا۔ اس میں وحدانیت پر زور دیا جاتا تھا۔ بادشاہ

ط EDESSA.

نے اپنے بیٹے سے فرمایا:-

"تو محافظِ دین اور امینِ المُلک ہے۔ مذبح اور تخت دونوں تیرے ہی ہیں۔" سنہ ۳۱۳ء میں تو مسیحی رُومی شہنشاہ نے فارس کے بادشاہ کو مراسلہ ارسال کیا جس میں تحریر تھا:-

"ما بدولت یہ سُن کر خُوش ہیں کہ فارس کے خوبصُورت علاقوں کی رونق مسیحیوں کی موجُودگی کی وجہ سے دوبالا ہو رہی ہے۔"

یہ مُراسلہ جس میں خیر اندیشی کے جذبات کا اظہار کیا گیا تھا فارسیوں کے لئے شُبہات کا سبب بن گیا اور اُنہوں نے سمجھا کہ وُہ اِس مُلک میں سلطنت رُوما کے جاسُوس ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سنہ ۳۳۹ء سے سنہ ۳۷۹ء تک سولہ ہزار مسیحیوں کو شہید کر دیا گیا۔ اس جگہ کی کلیسیا رُومی سلطنت کی کلیسیا سے آزاد رہنا چاہتی تھی۔ سنہ ۴۱۰ء میں سلوکیہ طیسفون[ط] کا بشپ مشرق کی کلیسیا کا مُسلّمہ اُسقفِ اعظم تھا۔ یہ کلیسیا یہی نام استعمال کرتی ہے لیکن دُوسرے لوگ اکثر اوقات اُنہیں نسطوری مسیحی کہتے ہیں، کیونکہ اُس نے اس کے بعد بڑی آزادی سے خُداوند مسیح کے متعلق اِس قسم کی تعلیم دینا شروع کی جسے مغرب نے رد کر دیا۔ نسطوریس (قسطنطنیہ کا بشپ سنہ ۴۲۸ء) کا عقیدہ تھا کہ جب خُداوند یسُوع مسیح کے متعلق بات کی جائے تو اُس کی انسانیت کو اُس کی اُلوہیت سے علیحدہ رکھنا چاہیئے۔ اپنے وعظوں میں اُس نے ایسا ظاہر کیا کہ گویا مسیح یسُوع انسان میں دو شخصیتیں ہیں۔ ایک الٰہی دُوسری انسانی۔

ط SELEUCIA-CETESIPHON.

اُس نے یہ تعلیم دینی شروع کی کہ انسانی فطرت جو اُس کو مُقدّسہ مریم سے حاصل ہُوئی خُدا کے بیٹے کی الٰہی ذات کے ساتھ پیوستہ نہیں ہو سکتی۔ خُداکنواری مریم سے پیدا نہیں ہُوا، صرف الوُہیت نے یسُوع کی انسانی فطرت میں سکُونت اختیار کی۔ اس تعلیم سے مسئلہ تجسّم اور چند دیگر مسائل معرضِ خطر میں پڑ گئے۔ مشرق کی یہ کلیسیا فارس میں محفُوظ نہ تھی، لیکن سنہ ۶۳۵ء تک یہ ایشیا سے چین تک پھیل گئی۔

ایشیا سے دُوسرے ممالک کو جانے کے لئے عرب کو بڑی اہمیّت حاصل تھی۔ کہتے ہیں کہ سکندریہ کا پنٹینس[1] سنہ ۱۸۰ء میں ہندوستان آیا تھا اور اُس نے دیکھا کہ اس جگہ مسیحی موجُود ہیں۔ اِن مسیحیوں کے پاس عبرانی زبان میں مُقدّس متّی رسُول کی انجیل تھی جسے مُقدّس رسُول برتلمائی اِن کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ جیروم نے یہ لکھا ہے کہ پنٹینس کا مقصد یہ تھا کہ وُہ برہمنوں اور فلاسفروں میں انجیل مُقدّس کی مُنادی کرے۔ پس اُس نے خیال کیا کہ یہی ہندوستان ہے۔ بعض عُلما کا خیال ہے کہ پنٹینس عرب کے جنُوب میں یمن تک ہی پہنچا تھا۔ یہ علاقہ مسیحیت کے نُور سے منوّر تھا اور کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی تھیوفلس نے ہندوستان کی طرف روانہ ہوتے ہُوئے یمن کے بادشاہ کو مسیحی کیا تھا۔

سنہ ۲۲۰ء کے قریب ایڈیسہ میں کسی شخص نے ایک خیالی کتاب لکھی

[1] PANTAENUS.

جس کا نام "تُوما رسُول کے اعمال" ہے۔ اس کتاب میں مرقُوم ہے کہ بارہ رسُولوں نے اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے قرعہ ڈالا کہ رسُول کن کن ممالک میں تبلیغ کے لئے جائیں۔ مُقدّس تُوما رسُول کے نام ہندوستان میں جاکر تبلیغ کرنے کا قرعہ نکلا۔ وُہ بادشاہ گنڈا فورس اور اُس کے بھائی کے دربار میں آیا۔ یہ نام تواریخی معلُوم ہوتے ہیں۔ پنجاب کا ایک حکمران ونڈا فارنا[1] اور ہمسایہ ریاست کا شہزادہ گُودا[2] سنہ ۵۰ء میں ہندوستان میں تھے۔ کیا مُقدّس تُوما رسُول ہندوستان میں آئے تھے؟ اس مشکُوک ماخذ کے سوا کوئی اور دستاویزی ثبُوت موجُود نہیں ہے۔ اوریجن نے (سنہ ۲۵۰ء) متّی ۲۴: ۱۴ کی تفسیر کرتے ہُوئے لکھا ہے کہ ابھی تک انجیل مُقدّس کی مُنادی چین اور ہندوستان میں نہیں کی گئی۔ ہم نے اس سے پیشتر دیکھا ہے کہ فلسطین کے علاقوں سے لوگ اکثر ہندوستان میں آیا کرتے تھے۔

جنُوبی ہندوستان کے سریانی مسیحیوں میں روایت چلی آتی ہے کہ مُقدّس تُوما رسُول ہندوستان آئے تھے۔ اِن مسیحیوں کو اس روایت پر پُورا یقین ہے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی کے سیاح مدراس کے قریب مائلاپُور میں مُقدّس تُوما رسُول کے مزار کی زیارت کیا کرتے تھے۔ پرتگیزوں نے سنہ ۱۵۲۲ء میں اس مزار کو دریافت کیا۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ مُقدّس تُوما رسُول ہندوستان تشریف لائے تھے اور اس کے حق میں اور اس کے خلاف جو شہادتیں پیش

[1] VINDA PHARNA [2] GUDA.

کی جاتی ہیں وُہ متوازن ہیں تاہم تیسری صدی کے اختتام کے بعد اِس مُلک میں مسیحیّت کی آمد کے متعلق خُود مُختار شہادتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ہم بصرہ کے بشپ ڈیوڈ کے متعلق پڑھتے ہیں کہ وُہ ۲۹۵ء میں ہندوستان آئے اور اُنہوں نے بہُت سے لوگوں میں انجیل کی مُنادی کی۔ غالباً خلیج فارس کے راستے آئے ہوں گے۔ نائسیہ کی کونسل میں جو ۳۲۵ء میں مُنعقد ہُوئی ایک بشپ نے اپنے آپ کو "فارس اور عظیم ہندوستان کا یُوحنّا" کہا۔ پس ممکن ہے کہ خشکی کے راستے مسیحیت فارس سے یہاں پہنچی ہو۔ ۳۵۴ء میں رُومی شہنشاہ کانسٹنٹیس[۱] نے تھیوفلس ہندوستانی کی زیر سرکردگی ایک وفد روانہ کیا جس نے جلشہر، سقوطرہ، لنکا اور ہندوستان میں رہنے والے مسیحیوں سے مُلاقات کی۔

جنُوبی ہندوستان میں ایک زبانی روایت ہے کہ ۳۴۵ء میں تُوما کنعانی کی سرکردگی میں ۴۰۰ مسیحی ہندوستان میں آئے۔ اُن کے ساتھ ایک بشپ اور بہُت سے خادمانِ دین تھے۔ اُنہوں نے مالابار کے بادشاہ سے اِس مُلک میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی۔ اُنہیں کچھ مراعات کا چارٹر ملا۔ دو شہادتیں اِس روایت کو ثابت کرتی ہیں۔

اوّل:- مراعات کا یہ چارٹر ۱۵۴۴ء تک موجُود تھا اور ایک پرتگیزی مُصنّف گووؔیا[۲] نامی نے اس کے ساٹھ سال بعد اس کا ذکر کیا ہے۔

---

[۱] CONSTANTIUS [۲] GOUVEA.

دوم ۳۴۵ء کی تطبیق فارس کی سخت ترین ایذا رسانیوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لئے سوداگروں اور جنوبی ہندوستان کے لوگوں اور اپنے آشنا مسیحیوں کے ساتھ تجارت کرنے والوں کے لئے یہ موقع تھا کہ وُہ ہجرت اختیار کریں۔

سکندریہ کا ایک مسیحی کاروباری آدمی کوسمس[۱] تھا۔ اُس نے ۵۲۰ء میں بحیرہ عرب کا سفر کیا اور اس کے بعد وُہ یُوں رقمطراز ہے:-

"لنکا کے جزیرہ میں ایک مسیحی گرجا بھی ہے اور خادم دین اور ایماندار بھی ہیں، لیکن مجھے معلُوم نہیں ہے کہ اس کے علاوہ بھی کسی جگہ مسیحی ہیں۔ اسی طرح سے مالابار کے مقام پر جہاں کالی مرچ پیدا ہوتی ہے اور بمبئی کے قریب کلیان کے مقام پر بھی گرجے اور ایمانداروں کی جماعتیں ہیں۔ فارس سے ایک بشپ منتخب ہو کر آیا ہے۔ اسی بحر ہند میں سقوطرہ کے مقام پر بھی بشپ اور کلیسیا کے پاسبان موجُود ہیں۔ لنکا کے جزیرہ میں فارسی مسیحیوں کی کلیسیا ہے۔ یہ لوگ اسی جگہ آباد ہو گئے ہیں۔ اُن کا اپنا پریسبٹر بھی ہے۔ وُہ فارس کی طرف سے مقرر ہو کر آیا ہے۔ اُن کا اپنا ڈیکن بھی ہے لیکن مقامی باشندے اور بادشاہ بُت پرست ہیں"۔ اس لئے یہ بات یقینی ہے کہ ہمارے اپنے زمانے کے اختتام تک مسیحی سوداگر اس ایمان کی تبلیغ کرتے تھے اور مسیحی مُبشّر بھی اُن کے ساتھ ایشیا سے ہندوستان اور لنکا پہنچے۔

---

[۱] COSMAS.

افریقہ:- افریقہ کے برّاعظم میں مصریوں نے مسیحیت کا پیغام سُنایا۔ یُوسیبیس (سنہ ۳۱۳ء) نے ایک روایت کا ذکر کیا ہے جو سینہ بسینہ لوگوں میں چلی آرہی ہے۔ اس کے مطابق مُقدّس مرقس رسُول پہلے مشنری تھے جنہوں نے اس خطۂ سرزمین میں انجیل کا پیغام سُنایا اور سکندریہ میں کلیسیائیں قائم کیں۔ اس شہر میں نصف آبادی یہودیوں کی تھی اور مصر میں دُوسری جگہوں پر بھی کثرت سے یہودی آباد تھے۔ وہ بڑے ترقی یافتہ اور بارسُوخ تھے اور ممکن ہے کہ انہوں نے ہی مُقدّس مرقس رسُول کو انجیل مقدّس کی تبلیغ کرنے کا موقع بہم پہنچایا ہو۔ مندرجہ ذیل حقائق سے مصر میں یُونانی مسیحیت کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔ یُونانی زبان میں نئے عہدنامے کے سب سے زیادہ قدیمی نسخے کا کچھ حصّہ سنہ ۱۳۰ء میں اسی جگہ دستیاب ہُوا تھا اور سب سے قدیمی مکمل نسخہ بھی اسی جگہ سے ملا تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سنہ ۱۸۰ء سے قبل سکندریہ میں پنٹینس نے مسیحی دارالعلُوم کی بُنیاد ڈالی تھی۔ کلیمنٹ اور اوریجن اُس کے جانشین تھے۔ اس خطۂ سرزمین کے لوگوں تک خُدا کا کلام پہلی صدی کے اوائل ہی میں پہنچ گیا اور شہر کے یُونانی بولنے والے لوگ بھی اس پیغام سے بہرہ ور ہوئے۔ غالباً تیسری صدی میں ان لوگوں کے لئے مصری زبان میں نئے عہدنامے کا ترجمہ کیا گیا۔ انجیل مُقدّس عبرانی زبان میں

ا ۔ PANTAENUS.

ذرائع آمدورفت

مشرق کے لئے لکھی گئی۔ لاطینی میں مغرب کے لئے اور مصری میں براعظم افریقہ کے اس حصّہ کے لئے تھے۔ تینوں براعظموں میں ان باشندوں کی اپنی زبان میں مسیحیت کی تعلیم مہیا تھی۔ اس براعظم سے زیادہ دُنیا کے کسی مُلک میں اس سے زیادہ مسیحیوں پر ایذا رسانی نہیں کی گئی۔ اوریجن نے اپنی جوانی کے ایام (سنہ ۲۰۲ء) میں لکھا ہے کہ مصر میں "شہیدوں کی ان گنت تعداد" تھی اور سنہ ۲۵۰ء میں اوریجن نے بڑے وثوق سے لکھا ہے۔

"خداوند مسیح کی بادشاہت کے سوا تمام قسم کے عبادت کے طریقے عنقریب ہستی سے مٹ جائیں گے، صرف اُسی کی بادشاہت ابدالآباد تک قائم رہے گی جب خداوند مسیح کی تعلیم کے اصولوں کا دوسرے لوگوں کے دِلوں پر اثر ہوگا تو ایک دِن اُس کی بادشاہت تمام رُوئے زمین پر کامیاب و کامران ہوگی۔"

یوسیبئس نے لکھا ہے کہ سنہ ۳۱۱ء کی ایذا رسانی میں اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ "ہزارہا مردوں اور عورتوں اور بچّوں کو بیدردی سے قتل کیا گیا حتّٰی کہ جلّاد بھی قتل کرتے کرتے تھک گئے"۔ ان شہیدوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی دولت، عالی نسبی اور علم و فضل کی وجہ سے مشہورِ زماں تھے لیکن اُنہوں نے اپنے منجّی پر ایمان رکھنے کو ہر ایک چیز پر مقدم رکھا"۔ یہ ایسا اعلانیہ تھا جو ایک تبدیلی کے لئے تیار تھا (سنہ ۳۱۲ء) یعنی ایسی حکومت

کے لیے تیار تھا جو مسیحیت کی طرف مائل تھی۔ اس وقت اوریجن کی پیشین گوئی پوری ہونے لگی اور دوسرے مذاہب ختم ہونے لگے۔ سکندریہ کے بشپ کی قیادت میں کلیسیا اپنی روحانی آزادی کا اظہار کرنے لگی۔

مصر کے بالائی حصوں میں انتونی قبطی (سنہ ۲۵۱ء) نے اپنے گاؤں کو الوداع کہا اور راہبانہ زندگی اختیار کر کے صحرا میں رہنے لگا۔ یہ بات بڑی ہی عجیب ہے کہ اگرچہ وہ تارک الدنیا ہو چکا تھا، تاہم چوتھی صدی کی مسیحی کلیسیا پر اس کا بڑا ہی اثر ہوا۔ سنہ ۳۱۱ء میں وہ اچانک سکندریہ کے بازاروں میں آ نکلا اور اس نے مسیحیوں کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کی اور ایذا پہنچانے والے لوگ اس کا کیا بگاڑ سکتے تھے جس نے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ دوسری مرتبہ سنہ ۳۲۵ء میں ظاہر ہوا جب بدعت کا زبردست خطرہ تھا، یہاں تک کہ شہنشاہ کانسٹنٹائن نے اسے لکھا کہ:

"وہ خدا میں اس کا باپ ہے۔" ایک زمانے میں جب رومی سلطنت نے مسیحی مذہب اختیار کر لیا اور بہت سے مسیحی محض نام نہاد مسیحی تھے تو انتونی نے احتجاج کیا کہ مسیحی شعار آسان چیز نہیں ہے کیونکہ مسیح تو سب کچھ دے دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔

"ہر اس آدمی کو جس نے دنیا تیاگ دی ہے یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ اس نے کوئی بہت ہی بڑا کام سرانجام دیا ہے۔ لا محدود

آسمانی بادشاہت کے مقابلہ میں یہ ساری زمین بے مایہ اور حقیر ہے۔"

یہ تحریک جس نے رہبانیت کی صورت اختیار کر لی، مشرق اور مغرب میں پھیلنے لگی۔ وہ لوگ جو اپنا سب کچھ دے دینا چاہتے تھے راہب بن گئے اور چونکہ یہی لوگ انجیل مقدس کی خدمت کے لئے مخصوص مسیحی تھے اس لئے یہی راہب مشنری بن گئے، اور اگلے ایک ہزار سالوں تک مسیحیت زیادہ تر ان ہی راہبوں کی مساعی جمیلہ کی وجہ سے پھیلنے لگی۔

مصر کی طرح شمالی افریقہ بھی اٹلی کا بڑا اہم اناج گھر تھا۔ شمالی ساحل کے شہروں میں رومیوں کا طرز تمدن نظر آتا تھا۔ رومی استعمار پرستوں کے علاوہ ابتدائی آبادکاروں کی اولاد بھی ان شہروں میں رہائش پذیر تھی۔ یہاں فونیشین[1] اور یہودی بھی تھے۔ اصلی باشندے بربر تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مسیحیت ساحلی علاقے کے لاطینی بولنے والے لوگوں میں پھیلی۔ سنہ ۱۸۰ء کے بارہ شہیدوں میں سے گیارہ کے نام لاطینی ہیں۔ بارھویں کا نام فونیشین تھا۔ تیونس میں تین بڑے لاطینی فادر پیدا ہوئے یعنی ترتولین (وفات سنہ ۲۳۰ء) سپرین (وفات سنہ ۲۵۸ء) اور اگسٹین (وفات سنہ ۴۳۰ء) شہیدوں اور فادروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی افریقہ کے مسیحی سرگرم اور بڑے عبادت گذار اور پارسا تھے۔ افسوس ہے کہ کچھ ایسے مسیحی بھی تھے جو جنونی اور انتشار پسند تھے۔

۱۔ PHOENICIAN.

.... ذاتی اختلافات کی بنا پر کلیسیا
میں پھوٹ پڑ گئی۔ یہ تفرقہ بازی یعنی ڈونیٹ ازم[1] ذاتی اختلافات کی
وجہ سے پیدا ہوئی۔ یہ اختلافات بڑھتے ہی گئے اور سرمایہ دار، استعمار
پرستوں اور غریب بربروں کے درمیان معاشرتی اور نسلی اختلافات
نے تلخ صورت اختیار کر لی۔ ڈونیٹ ازم ابتدائی زمانے میں
مسیحیت میں تفرقے کی ایک ایسی مثال ہے جس نے مسیحیت کی
قوت کو بہت کمزور کر دیا۔ ایک کمزور اور باہمی اختلافات رکھنے
والی کلیسیا کس طرح ساتویں صدی مسیحی میں اسلام کا مقابلہ کرنے کے
قابل ہو سکتی تھی؟

مسیحیت سنہ ۳۳۰ء میں بحیرہ قلزم کے راستے افریقہ میں داخل ہوئی۔
ایڈیسیس[2] اور اس کا بھائی فرومینٹیس ایک جہاز میں سوار تھے۔ یہ جہاز
بحیرہ قلزم کی ایک بندرگاہ پر ٹھہرا۔ ان دونوں نوجوانوں کے سوا
باقی تمام مسافروں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ یہ دونوں نوجوان اکسوم[3] کے مقام
پر شاہی خاندان کے خدمت گاروں میں شامل ہو گئے۔ آہستہ آہستہ
وہ بادشاہ کے منظور نظر بن گئے اور بادشاہ کی وفات پر وہ
بادشاہت کے ریجنٹ مقرر ہوئے۔ فرومینٹیس[4] کی اکسوم کی مسیحی سوداگروں
سے ملاقات ہوئی جو اکسوم میں تجارت کیا کرتے تھے۔ اس نے یہاں
ایک عبادت گاہ یا دعا کی جگہ تعمیر کی اور کچھ لوگوں کو مسیحی بنا لیا۔
اس کے بعد ان دونوں بھائیوں کو گھر واپس جانے کی اجازت

۱؎ DONITISM ۲؎ AEDESIAS ۳؎ AGUM ۴؎ FRUMENTIUS.

مل گئی لیکن فرومینٹیس اسکندریہ کے بشپ اتھانیسیس[1] کے پاس
پہنچا اور اس سے استدعا کی کہ ایک بشپ اور ایک پادری وہاں
بھیج دیا جائے۔ اتھانیسیس نے جواب دیا "آپ سے زیادہ
اور کون اس کام کے لیے موزوں ہے؟" اس طرح سے فرومینٹیس
مذکورہ حبشہ کی کلیسیا کا بانی ہوا اور یہی کلیسیا (اپنی مادری کلیسیا
قبطی کلیسیا کے ساتھ) فادرزن کی کلیسیا کی افریقہ کی طرف سے
نمائندہ ہے۔ قبطی کلیسیا کے برعکس حبشہ کی کلیسیا اس ملک میں ہے

یورپ۔ اب ہم مندرجہ ذیل باتوں کا جائزہ لیں گے۔

- کانسٹنٹائن سے قبل مغرب میں مسیحیت۔
- مسیحیت رومی سلطنت کا مذہب۔
- مسیحیت مغربی رومی سلطنت کے خاتمہ کے بعد تک بھی قائم رہی۔
- شمال مغرب بعید میں نئی وسعت۔

(۱) کانسٹنٹائن سے پہلے مغرب میں مسیحیت۔ روم میں سب
سے پہلے کس نے مسیحیت کی تبلیغ کی؟ ایک غیر مسیحی مورخ ٹیسی ٹس[2]
جو ۱۱۶ء میں گزرا ہے روم میں مسیحیت کی موجودگی کے متعلق کہتا ہے
کہ دارالسلطنت ایسا غلاظت کا گڑھا ہے جہاں تمام قسم کی گندگی اکٹھی
ہو گئی ہے۔ ۴۹ء میں مسیحیوں کے خلاف شورش برپا کرنے کے الزام
میں (اعمال ۱۸: ۲) تمام یہودیوں کو شہر سے نکال دیا گیا۔ اس کے چند
سالوں بعد روما کے مسیحیوں کے پاس پولس رسول کا نہایت اہم

۱؎ ATHANASIUS ۲؎ TACITUS.

خط آیا۔ اس صدی کے اختتام پر رُومہ کی کلیسیا ابھی تک کرنتھس میں اس خط کے موضوع پر سوچا کرتی تھی۔ پولُس رسُول کے زمانہ میں بھی اس کا یہی حال تھا یعنی اس کلیسیا میں تنظیم کا فقدان تھا اور کلیمنٹ نے انہیں بے حد تلقین کی کہ وہ نظم و ضبط کا خاص خیال رکھیں۔ رُومہ کے بشپ نے ۱۵۲ء میں سمرنا کے عُمر رسیدہ بشپ پولیکارپ کو جو یُوحنّا رسُول کا شاگرد تھا اپنے پاس بُلا بھیجا کیونکہ ایشیا ئے کوچک اور رُومہ کے مسیحیوں میں عیدِ قیامت (ایسٹر) کی تاریخ کے متعلق اختلاف تھا۔ رُومہ کی فارغ البال اور امیر کلیسیا بلقان کے مسیحیوں کو مالی امداد بھیجا کرتی تھی۔ بلقان کے مسیحیوں سے کانوں میں کام کروایا جاتا تھا۔ ان مشرقی تعلّقات کی وجہ سے حیران و پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مسیحیّت نہ صرف مشرق سے آئی تھی بلکہ بہُت سے رُومی مسیحی بھی مشرق کی سرزمین میں پیدا ہوئے تھے اور تیسری صدی مسیحی تک ان میں سے بیشتر لوگ یونانی بولتے تھے۔ ۱۶۳ء کے رُومہ کے شہیدوں میں جسٹن کا نام گرامی بھی ملتا ہے۔ وہ میلادی مُفکّر فلسطین کی پیدائش تھا اور افسس میں مشرف بہ مسیحیّت ہوا تھا۔ کئی دوسرے قیدیوں نے منصف کو بتایا:۔

"ہمیں یہ دین اپنے والدین سے ورثہ میں ملا ہے۔"

اور جب اُن سے سوال کیا گیا کہ تمہارے والدین کہاں ہیں تو انہوں نے ایشیا ئے کوچک میں اُن مقامات کے نام لیے جہاں اُن کے والدین رہا کرتے

تھے۔ اُس زمانے میں جب مسیحیّت ابھی ایک خُفیہ تحریک تھی، جسٹن نے منصف کے سامنے جو بیان دیا اُس سے ایک مُبشّر کے کام پر روشنی پڑتی ہے:۔

"میں پاتھر سٹریٹ میں بڑی ریاضت کی زندگی بسر کرتا ہُوں۔ میں رُومہ میں اب دُوسری مرتبہ آیا ہُوں۔ میں اس سخت ریاضت کی زندگی کے سوا کسی اور زندگی کے متعلّق کچھ نہیں جانتا۔ اگر کوئی میرے پاس آتا ہے تو میں اُسے حق کے اصُول بتاتا ہُوں۔"

۲۳۰ء تک بائبل مُقدّس کا لاطینی میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ اس سے بہُت عرصہ پیشتر رُومی نسل کے مسیحی رُومہ میں موجود تھے۔ ان میں سے بعض تو بڑی مشہور و معروف ہستیاں تھیں۔ مکاشفہ کی کتاب میں جس ایذارسانی (۹۵ء) کا ذکر ہے، اس میں شہنشاہ کے چچا زاد بھائی فلیوس کلیمنٹ کو شہید اور اُس کی بیوی کو جلاوطن کیا گیا۔ ۲۵۰ء تک مسیحیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ سات علاقوں میں منقسم تھے۔ ان میں چھیالیس (۴۶) پریسبٹر اور پندرہ سو کے قریب ایسے لوگ تھے جنہیں خداوند یسُوع مسیح کے فضل اور اُس کی بخشش سے تقویّت ملتی تھی۔ اُس وقت جنوبی اٹلی میں ایک سو بشپ تھے۔ شمال میں مسیحیوں کی تعداد بہُت کم تھی۔ ہم اس سے زیادہ تو یہ تاثر لیتے ہیں کہ اس وقت ایسی کلیسیا موجود تھی جس کی ثقافت تو یونانی تھی لیکن وہ رُومی نظم و ضبط میں ترقی کر رہی تھی۔ بڑے مقتدر اور سربرآوردہ لوگ حلقہ بگوشِ مسیحیّت ہو رہے تھے۔ یہ کلیسیا بڑی خوشی سے رسُولی روایات پر

؎ FLAIRUS CLEMENT.

پابند تھی۔ اُسے اپنی ذمہ داریوں کا شدید احساس تھا کیونکہ وہ مغرب
کا ایک بڑا اُسقفی حلقہ تھی۔

ہم نے اس سے پیشتر جسٹن کا بیان نقل کیا ہے کہ مسیحی سیاح اور
سوداگر اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کیا کرتے تھے۔ گال (فرانس)
میں بعینہٖ یہی حالت تھی۔ مسیحیت تجارتی شاہراہوں اور خاص طور پر جنوب
کے شہروں اور دریائے رون کی وادی میں پھلنے پھولنے لگی۔ ۱۷۷ء میں
لائیونز[1] اور ویانا[2] کے ۴۸ شہیدوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں لاطینی
اور یونانی نام بھی ہیں۔ بشپ ائیرینیس[3] جنہوں نے اس مصیبت زدہ
گلّے کے بقیہ کی نگہبانی کی، ایسی ہستی ہیں جو ایمان راسخ کی بہترین مثال
ہیں۔ بشپ موصوف نے سمرنا میں نشوونما پائی تھی، جہاں یونانی بولی جاتی
تھی۔ وہ لائیونز میں کلیسیا کی خدمت پر مامور ہوا۔ یہاں لاطینی
بولی جاتی تھی۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو کیلٹک[4] یعنی گالک[5]
میں تعلیم دینی شروع کی۔ وہ پولیکارپ کا بھی شاگرد تھا اور
پولیکارپ یوحنا رسول کا شاگرد تھا، اس لئے اُس کے ذیل
کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔

"اگرچہ کلیسیا ساری دنیا میں پراگندہ ہو چکی ہے تو بھی یہ اپنے
ایمان کی اس طرح سے حفاظت کرتی ہے گویا تمام کلیسیا ایک ہی
گھر میں قیام پذیر ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ اس کا دل ایک ہے
اور اس طرح سے منادی کرتی ہے جیسے اس کا ایک ہی منہ ہے اور اگرچہ

[1] LYONS [2] VIENNE [3] IRENIENS [4] CELTIC [5] GALIC.

دنیا میں بے شمار زبانیں ہیں تاہم روایت ایک ہے اور ہر ایک جگہ
ایک جیسی ہے۔"

مقدس پولس رسول کا ارادہ تھا کہ وہ روم سے ہو کر ہسپانیہ
جائے گا۔ ممکن ہے کہ مسیحیت اسی راستہ سے جنوب اور مشرق
کے ساحلی شہروں میں پہنچی ہو جو رومی طرزِ تمدن اپنا رہے تھے۔ ہسپانیہ
کی کلیسیا نے ایک عظیم المرتبت شخصیت پیدا کی جس کا نام ہوسی اُس[1]
تھا۔ وہ کارڈووا[2] کا بشپ تھا۔ آخری ایذا رسانی میں اُس نے بڑی
مصیبتیں برداشت کیں تاہم اُس نے سو سال کی عمر پائی (۲۵۷ء تا ۳۵۷ء)

طرطولین (۱۹۰ء) نے بیان کیا ہے کہ ان برطانوی مقامات جہاں
ابھی تک رومی تسلط قائم نہیں ہو سکا وہاں خداوند مسیح کے اصولوں
کی عملداری ہے۔" ۳۱۴ء میں ہمارے پاس لندن، یارک اور آئیلنیز
کی اسناد کے اسقفی حلقہ کی معتبر شہادتیں موجود ہیں۔

پہلے مسیحی شہنشاہ کی آمد کی وجہ سے برطانیہ اور ہسپانیہ میں ایک
غیر متوقع رشتہ نظر آتا ہے۔ ۳۰۶ء میں جب شہنشاہ کانسٹنٹائن کا باپ
فوت ہوا تو وہ یارک میں تھا۔ اُس کے شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا
لیکن تخت کے دوسرے دعویدار بھی تھے۔ کانسٹنٹائن نے گال[3] اور
ہسپانیہ کے ملکوں میں سفر کیا تب ۳۱۲ء میں تخت کے آخری دعویدار
حریف سے روم کے باہر فیصلہ کن جنگ سے پیشتر اُس نے صلیب
کی رویا دیکھی اور اُس نے یہ آواز سنی "نشانِ صلیب" [illegible]

[1] HOSIUS [2] CARDOVA [3] GAUL.

جھنڈے کی بدولت فتح ہوگی۔" اُس نے خیال کیا کہ مسیحیوں کے خُدا کی وجہ سے اُسے فتح حاصل ہُوئی ہے۔ اُس نے بشپ ہوسی اُس[1] کو بُلا بھیجا کہ وُہ اُسے آکر بتائے کہ ایک مسیحی کو کس طرح حکومت کرنی چاہیے۔ شاید ہسپانیہ کے کارڈوا میں بشپ ہوسی اس نے کانسٹنٹائن کو مسیحی دین کا پیغام دیا تھا اور اُس پر بہُت زیادہ اثر ہُوا تھا۔

۲۔ سلطنت کا مذہب۔ مسیحیت کی طرف مائل شہنشاہ کانسٹنٹائن کے زمانے میں ساری سلطنت آخر کار نئی صُورتِ حالات سے متاثر ہُوئی۔ ۳۱۳ء میں فرمانِ میلان[2] جاری کیا گیا جس کے باعث مسیحیوں کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا جانے لگا اور اُنہیں پُوری آزادی دی گئی۔ مسیحیوں کی وُہ جائداد جو ضبط ہو چُکی تھی، اُنہیں واپس کر دی گئی۔ ۳۳۰ء میں سب سے اہم بات یہ ہُوئی کہ قسطنطنیہ کو نیا دارالسلطنت بنایا گیا۔ قسطنطنیہ سے کانسٹنٹائن نے ایک بشپ کو یہ الفاظ لکھے۔

"اس شہر میں جو میرے نام سے کہلاتا ہے چُونکہ اس میں بیشمار لوگ کلیسیا میں شامل ہو رہے ہیں، لہٰذا یہاں گرجوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونا چاہیے۔ مَیں حُکم دیتا ہُوں کہ بسُرعت تمام کلام اللہ کی پچاس نقُول تیار کروائی جائیں۔ آپ کو دو قسم کی سواری مل سکتی ہے۔ آپ ایک ڈیکن کو میرے پاس بھیج دیں اور مَیں زرِ خطیر عطا کروں گا۔ برادرم! خُدا آپ کو سلامت رکھے۔"

[1] BISHOP HOSIUS [2] EDICT OF MILAN.

اس واقعہ سے کُل صُورتِ حال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اب مسیحیوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ وُہی مسیحیت جو زیرِ عتاب تھی اور جس پر سختیاں ڈھائی جاتی تھیں اب اُسے ہر طرح کی مراعات حاصل تھیں۔ نئے گرجے تعمیر ہونے لگے اور نہ صرف گرجوں کی تعداد بڑھ گئی بلکہ اب گرجے تمام دیگر عمارتوں سے زیادہ اہم مقامات تصوّر کئے جانے لگے۔ چُونکہ شہنشاہ نے مسیحیت میں دلچسپی کا اظہار فرمایا اس لئے اُس کا یہ مفہوم تھا کہ سلطنت کے خزانے سے کلیسیا کی امداد کی جائے گی۔ بعض لوگوں نے یہ رائے پیش کی کہ کانسٹنٹائن کی کرم نوازی بہُت سی بُرائیوں کا پیش خیمہ ثابت ہُوئی اور اُس کے مُشرف بہ مسیحیت ہونے کی وجہ سے فائدے کی بجائے زیادہ نقصان ہُوا۔ مسیحیت میں ادنیٰ معیار اور ظاہری شان و شوکت کے دلدادہ لوگ شامل ہونے لگے اور حکُومتِ وقت نے مذہبی معاملا میں دخل دینا شرُوع کر دیا۔ بدلے ہُوئے حالات میں نئی نئی آزمائشوں نے سر اُٹھایا۔ کلیسیا ایک ایسی اقلیّتی تحریک تھی جو ایذا رسانیوں کا شکار بنی رہی۔ وُہ ہمیشہ دُنیا کی شان و شوکت سے بے نیاز رہتی رہی تھی، لیکن اب چُونکہ اُسے شاہی سرپرستی حاصل تھی لہٰذا اب وُہ دُنیوی جاہ و جلال کی دلدادہ بن گئی۔

اس زمانہ میں مسیحیّت تین علاقوں کا سرکاری مذہب تھا۔ ایشیا میں آرمینیا، افریقہ میں حبشہ اور رُومی سلطنت میں بحیرہ رُوم کی

گل سرزمین۔ آرمینیا اور حبشہ میں مسیحیت کی تعلیم ان ہی دو ممالک
تک محدود رہی لیکن بحیرہ روم کے ارد گرد کے علاقے میں یہی تعلیم
یورپین تہذیب کی اساس بننے والی تھی۔ ساتویں اور آٹھویں
صدی میں عربوں نے اور تیرھویں اور چودھویں صدی میں منگولوں
نے اہل مغرب کو نیچا دکھایا لیکن اہل مغرب نے دنیا کی سرحدوں
تک پہنچنے میں نام حاصل کیا۔ وہ مسیحیت کو اپنے آپ تک ہی
محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ دوسرے ممالک میں بھی اس کی
نشر و اشاعت کرتے تھے یعنی جہاں کہیں وہ جاتے، وہ انجیل
کا پیغام دوسروں کو بھی سنایا کرتے تھے۔

۳۔ مسیحیت کا رومی سلطنت کے بعد قائم رہنا

دوسری اور تیسری صدی مسیحی میں رومیوں کو دریائے ڈینیوب
کے شمال اور دریائے رائن کے مشرق میں ہر وقت جرمنی کے
قبیلوں کا خطرہ رہتا تھا۔ چوتھی صدی مسیحی میں ان سرحدوں پر جرمنی
قبیلوں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ پانچویں صدی مسیحی میں رومی ان
سرحدوں کی حفاظت نہ کر سکے۔ ۴۰۶ء میں جیروم (بیت لحم
کا ایک راہب) نے یوں تحریر کیا ہے۔
"خونخوار قبیلوں کی ان گنت تعداد نے تمام گال کو روند ڈالا ہے۔
الپس سے لیکر پائیرنیز اور دریائے رائن سے لے کر بحر اوقیانوس

تک کے علاقے کو تباہ کر دیا گیا ہے اور جو تلوار سے بچ جاتے ہیں
انہیں قحط نے موت کی نیند سلا دیا ہے۔ یہ داستان اتنی دلخراش
ہے کہ اسے بیان کرتے وقت آنسوؤں کا سیلاب امڈ آتا ہے۔"
شمال کے وحشی قبیلے مسیحیت سے متاثر ہو چکے تھے مثلاً ۲۶۴ء
میں گاتھ کے جیوش نے کپدکیہ پر حملہ کر دیا۔ وہ مسیحیوں کو اپنا غلام
بنا کر بحیرۂ اسود سے پار لے گئے۔
اُن پاک طینت اسیروں نے ان وحشیوں کے ساتھ میل
ملاپ کے ذریعہ سے انہیں مسیحی مذہب کی طرف مائل کر لیا۔ ان
اسیروں میں الفیلاس[5] کے آبا و اجداد تھے۔
۳۴۱ء میں الفیلاس گاتھ کا بشپ مخصوص کیا گیا۔ وہ سب سے
پہلا شخص تھا جس نے ایسا کام کیا جیسے مشنری صاحبان دنیا کے
بہت سے ممالک میں آج تک کر رہے ہیں۔ کلام مقدس کا ترجمہ کرنے
کی غرض سے اُسے ایسی زبان کے حروفِ ابجد کی تلاش ہوئی،
جس میں ابھی تک کوئی تحریر موجود نہ تھی۔ اُس نے بائبل مقدس
کا ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ شمالی یورپ کے لوگوں کے پاس سب سے پہلی
کتاب تھی۔ گاتھ کے علاوہ دوسرے قبیلے بھی اس سلطنت کی
تعریف و توصیف میں رطب اللسان تھے جن کے لئے وہ خطرے کا
باعث بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے مسیحیت کو قبول کیا کیونکہ اس کا تعلق
ترقی یافتہ تہذیب کے ساتھ تھا اور جب ۴۱۰ء میں گاتھوں نے روم کے شہر

[5] ULFILAS.

کو فتح کر لیا اور اٹلی سے بھاگنے والے لوگوں نے جب یہ سوال کیا کہ کیوں مسیحیت سلطنت کو بچا نہیں سکی تو صرف اگسٹین[1] نے اپنی کتاب بنام "خدا کا شہر"[2] میں اس سوال کا جواب دیا۔ اُس نے کہا کہ جنگ کا خوف کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن :-

"یہ بات نئی ہے کہ بڑے بڑے گرجے بچوں اور عورتوں کی پناہ گاہوں کے طور پر وقف کئے جا رہے ہیں۔ کون اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ مسیحیت اندھی ہے۔"

یہ حقیقت ہے کہ وحشیوں میں سے متعدد مسیحی تھے اگرچہ وہ اکھڑ قسم کے تھے، اس بات کا ثبوت ہے کہ جب روما کی مغربی سلطنت ختم ہو گئی تو مسیحیت زندہ رہی۔ یہ جدید تہذیب کی بنیاد تھی جس پر ازمنۂ وسطیٰ سے اسے (۵۰۰ - ۱۰۰۰) دھیرے دھیرے اُبھرنا تھا۔

۴۔ شمال مغرب میں کلامِ مقدس کی نئی وسعت و اشاعت

صرف شمالی حملہ آور ہی مسیحیت کے فیض سے محروم رہے۔ یہ لوگ فرانسیسی اور انگریز تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمال مغرب میں مسیحیت کی بقا کی کوئی اُمید نہ تھی لیکن اُسی وقت جبکہ مسیحیت کا خاتمہ آ رہا تھا بلکہ اُسی وقت اُس کے زندہ رہنے کا یقین بھی تھا۔ ۴۰۵ء میں بُت پرست حملہ آور پیٹرک[3] نامی ایک نوجوان انگریز کو غلام بنا کر آئرلینڈ لے گئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اُسے اپنے گھر میں امن کی زندگی میسر نہ ہو سکی۔

---
۱ AUGUSTINE ۲ THE CITY OF GOD ۳ PATRICK.

میں نے خیال کیا کہ میں نے اُن لوگوں کی آواز سُنی جو اُس جنگل کے پاس رہتے ہیں جو مغربی سمندر کے قریب ہے۔ وہ یک زبان ہو کر اُونچی آواز سے پکار رہے تھے "اے مقدس نوجوان! ایک دفعہ پھر ہمارے درمیان آ کر ہمیں کلامِ حق سُنا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کئی سالوں کے بعد خدا نے اُن کی فریاد کو سُنا اور اُن پر کرم کی نظر فرمائی۔

وہ مشنری بشپ مقرر ہو کر آئرلینڈ[1] میں پہنچا۔ اُس نے ۴۳۲ء تا ۴۶۱ء بشارت کی خدمت سرانجام دی جس زمانہ میں بُت پرست انگریز گرجوں کو جلا رہے تھے، آئرلینڈ کے راہب اس خدمت کے لئے تیار ہو رہے تھے کہ وہ سمندر کو پار کر کے اہلِ سکاٹلینڈ اہلِ انگلستان اور یورپ کے بے شمار باشندوں کو پیغامِ حق سُنائیں تاکہ وہ حلقہ بگوشِ مسیحیت ہوں۔

ریمو[2] کے بشپ کی رفیقۂ حیات ایک نیک خاتون تھی۔ اُس کی مسیحی زندگی سے فرانس کے بادشاہ پر بڑا اثر ہوا۔ ۴۹۶ء میں بشپ موصوف نے فرانس کے بادشاہ اور اُس کے تین ہزار جنگی جوانوں کو بپتسمہ دیا۔ بشپ موصوف نے وعظ کیا اور فرمایا کہ :- "آج تم اُسی صلیب کی پرستش کر رہے ہو جسے تم نے جلا ڈالا تھا اور اب تم اُن بتوں کو جلا رہے ہو جنہیں تم پوجا کرتے تھے"۔

شمال مغرب کی اس بعید سرزمین سے جو حال ہی میں مسیحی ہوئی تھی، مسیحیت شمالی یورپ کی طرف پھیلنے کو تھی لیکن پہلے کی نسبت مسیحیت زیادہ وسیع رقبے میں پھیلنے والی تھی۔

---
۱ IRELAND ۲ RAEIMO.

تیسرا باب

مغرب اور مشرق میں رکاوٹیں

(سنہ ۵۰۰ء تا سنہ ۹۵۰ء)

ہُن[1] قوم مغربی تہذیب و تمدّن کے زوال کا باعث بنی منگولیا[2] کے اِن خانہ بدوش گھوڑسواروں نے ساری دُنیا میں قیامت صُغرا برپا کر رکھی تھی۔ اُنہوں نے چین پر ایسا خوفناک حملہ کیا کہ ہان[3] خاندان کا صفایا کر دیا اور سنہ ۲۰۰ء سے سنہ ۶۰۰ء تک چین میں ایک تاریک دَور رہا۔ ہُن قوم کی ایک شاخ نے سنہ ۴۷۵ء میں شمالی ہندوستان میں گپتا خاندان[4] کی سلطنت کا چراغ گُل کر دیا۔ اس کا ایک لشکرِ جرّار یورپ میں داخل ہُوا اور اس نے جرمن قبیلوں کے خرمن امن کو جلا کر خاک کر ڈالا۔ اِس کے بعد ہُن رُوم کی طرف متوجّہ ہُوئے اور سنہ ۴۵۲ء میں سلطنت رُوما اُن کے مظالم سے لرز اُٹھی۔

سنہ ۶۰۰ء کے فوراً بعد دُنیا میں دو بڑی بڑی طاقتیں سر اُٹھا رہی تھیں۔ ٹینگ[5] خاندان کی زیر سرپرستی چین اپنی پُرانی شان و شوکت کو ازسرِ نو حاصل کر رہا تھا۔ اہلِ عرب بھی مشرق اور مغرب

---

[1] HUNS [2] MONGOLIA [3] HAN DYNASTY [4] GUPTA EMPIRE [5] TANG.

میں حملے کی تیاریاں کر رہے تھے اور اِن دُور دراز علاقوں کو فتح کر کے وہیں سکونت اختیار کرنے کو تھے۔ بُدھ مت جو ہندوستان سے شروع ہُوا تھا چین میں بڑی سُرعت سے پھیل رہا تھا۔ یہ مذہب اس زمانہ کی ایک عظیم قوّت تھی۔ عربوں کی تحریک کو حضرت محمّدؐ کے نئے مذہب سے قوّت حاصل کرنا تھا لیکن اُس وقت مسیحیّت کا کیا حال تھا؟

مغربی تہذیب کا زوال اور اسلام کا عرُوج تاریخ عالم میں مسیحیّت کی ترقّی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹیں تھیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ آرمینیا، حبشہ اور رُومی سلطنت کا سرکاری مذہب مسیحیّت تھا۔ آخرالذکر یعنی سلطنت رُوما مسیحی تہذیب کی سب سے بڑی نمائندہ تھی اور تقریباً سنہ ۵۰۰ء تک مغربی یورپ میں یہ تہذیب بھی ختم ہو چُکی تھی۔ اسلام کو جو سنہ ۶۲۲ء میں شروع ہُوا، مسیحیّت کا سب سے بڑا حریف بنا۔ ہم اِن دونوں رکاوٹوں پر غور کریں گے اور اُس کے بعد ترقّی کی دُوسری تحاریک کا تفصیلی جائزہ لیں گے اور اُنہیں اِن کے مُقابلے میں رکھ کر دیکھیں گے۔

تفصیل یُوں ہے:-

۱۔ کلیسیا کے لاطینی حصص کی بدولت شمالی یورپ کا مشرف بہ مسیحیّت ہونا۔

۲۔ یُونانیوں کا سلافیوں کو مسیحیّت کا پیغام سُنانا اور اُنہیں مسیح کے

ئے جیتنا۔

۳۔ سریانیوں کا ایشیا سے دوسرے علاقوں میں مسیحیت لے جانا۔

مغربی یورپ میں رومی تہذیب کا خاتمہ:۔ اب زندگی مقامی ہو گئی یعنی قبیلوں کا نظام قائم ہو گیا۔ سڑکوں اور شاہراہوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کوئی شاہراہ بھی آمدورفت کے قابل نہ تھی۔ شہروں کی آبادی کم ہو چکی تھی۔ بحری قزاقوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ قدیم تہذیب کے کھنڈرات سے ایک نیا جاگیردارانہ نظام جنم لے رہا تھا۔ یہ چیز بھی مقامی تھی اور اس کا تعلق کاشتکاروں کے ساتھ تھا جو زمین میں ہل جوتتے تھے وہ زمیندار کی خدمت بھی کرتے تھے اور اس کے عوض یہ مالک جاگیردار اُن کے مال و جان کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا تھا زندگی میں سب سے بڑی چیز جو وسیع مفاد پر حاوی تھی مذہب تھا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ مسیحیت ابھی زندہ تھی۔ مملکت میں آنے سے پیشتر جنوبی جرمنی کے قبیلوں نے مسیحیت کے اثر کو قبول کر لیا تھا اور شمالی قبائل جو سب سے زیادہ بہادر اور شہ زور تھے یعنی اہل فرانس گال[1] میں سکونت پذیر ہونے سے پیشتر ۴۹۶ء میں مشرف بہ مسیحیت ہو چکے تھے۔ اس مسیحیت کو جہالت اور تشدد کی وجہ سے قبول نہ کیا گیا۔ مذکورہ مسیحیت نے اس قسم کی تمام حدود کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور ان سے آگے نکل گئی۔ مقامی کلیسیا یا خانقاہ کا دارومدار

[1] GAUL.

کسی نہ کسی جاگیردار کے رحم و کرم پر ہوتا تھا، کیونکہ کلیسیا میں جو واقعات ظہور پذیر ہو رہے تھے اُن کی نوعیت مقامی نہ تھی بلکہ وہ عالم گیر تھے۔ رومی قوانین، کلیسیائی قوانین کی اساس تھے۔ پادریوں اور راہبوں میں ایسے لوگ موجود تھے جو ابھی تک لاطینی زبان بولتے، پڑھتے اور اُس کی نقل کیا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک روما ابھی تک مغربی مسیحی سلطنت کا دار الحکومت تھا۔ یورپ کو متمدن بنانے میں مسیحیت ایک عظیم جزو تھی جو ایک شاندار مستقبل کی نشاندہی کر رہی تھی۔ تاہم ترقی کی پہلی پانچ صدیوں کے مقابلے میں کلیسیا کے لئے یہ زمانہ اپنی بقا کے لئے بڑی جد و جہد کا زمانہ تھا۔ کلیسیا ازمنۂ مظلمہ کی تاریکیوں سے مسلسل برسرِ پیکار رہی۔

طلوعِ اسلام:۔ ایشیا کی سطوح مرتفع ہُن قوم کا وطنِ مالوف ہے۔ عرب کے ریگستانوں میں بسنے والی قوم نے اپنی فالتو آبادی کو وقتاً فوقتاً زیادہ زرخیز اور زرریز علاقوں کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔ اس قسم کی ایک ہجرت یا نقل مکانی ساتویں صدی مسیحی میں ہوئی لیکن یہ ہجرت اس سے پیشتر کی تمام ہجرتوں سے منفرد تھی کیونکہ اس کا تعلق ایک مذہبی تحریک سے تھا۔ اہل عرب نے مظہر قدرت کی پرستش کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اب انہوں نے "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہنا سیکھا۔ ہم نے اس سے پیشتر یہ دیکھا ہے کہ مسیحیت عرب میں اور اس کے قرب و جوار میں پھیلنے لگی۔ حضرت محمدؐ صاحب نے ابتدا

میں جب اس نئے مذہب اسلام کی تبلیغ شروع کی تو آپ یہودیوں اور مسیحیوں سے متاثر تھے۔ یہودی خدا کے لئے "الوہیم" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ سُریانی بولنے والے مسیحی الہٰ کہتے ہیں مُسلم عربی میں جو اللہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اُس کا ان دونوں کے ساتھ تعلق ہے۔ قرآن مجید کے مطابق حضرت محمدؐ صاحب کو جبرئیل کی معرفت خُدا کا پیغام ملتا تھا۔ لفظ قرآن خُود ایک مسیحی سُریانی اصطلاح ہے جو گرجاؤں میں ورد کی تلاوت کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ حضرت محمدؐ صاحب نے دعویٰ فرمایا تھا کہ آپؐ کا سلسلہ عہد عتیق کے نبیوں اور پیغمبروں سے ملتا ہے اور آپؐ نے تسلیم فرمایا تھا کہ خُداوند یسُوع آپ سے پہلے نبی ہو گزرے ہیں۔ اگر اُس زمانہ میں مسیحی گواہی موثر اور قوت والی ہوتی تو عرب کی اس تحریک کی وجہ سے یہ زبردست قوم ہزاروں کی تعداد میں مسیحیت کو قبول کر لیتی۔ لیکن اس کے برعکس ۶۲۲ء میں مذہب اسلام مسیحیت کے مدِ مقابل کی حیثیت سے ظاہر ہُوا۔ اس کے دس سال بعد عرب، فلسطین، سیریا اور مصر کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک صدی سے کم عرصہ میں اسلام نے شمالی افریقہ کی مسیحیت کا نام و نشان مٹا دیا۔ وُہ ہسپانیہ پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد عربوں نے فرانس پر حملہ کیا۔ اسی وقت وُہ ایشیائے کوچک سے مشرقی یورپ کی طرف بڑھے اور قسطنطنیہ کے لئے زبردست خطرے کا باعث بن گئے۔ مغرب اور مشرق کی مسیحی سلطنت کو اس تشدد کی تحریک نے بالکل نیست و نابود کر دیا۔

۷۱۸ء میں قسطنطنیہ کی مسیحی فتوحات اور فرانس میں ٹورز[1] نے ۷۳۲ء میں حالات کو خراب ہونے سے بچا لیا اور تھوڑی دیر کے لئے مشرق میں اسلام کی پیشقدمی کو وہ طارش اور مغرب میں پائرینیز[2] تک محدود رہی۔ ہسپانیہ پندرھویں صدی سے پہلے پہلے اپنی پہلی حالت پر نہ آسکا۔ سیریا، فلسطین اور مصر میں آج بھی مسیحی اقلیت مُسلمانوں کی بھاری اکثریت کے درمیان موجود ہے۔ آئیے اب اِن رکاوٹوں سے معاوضوں کی طرف بھی متوجہ ہوں۔

اوّل: شمالی یورپ کا مسیحی ہونا۔ ۵۰۰ء سے پیشتر کا ذکر ہے کہ رُوما کے ایک سکول میں ایک لڑکا زیرِ تعلیم تھا اُس کی عمر چودہ برس کی تھی۔ شہر کی اخلاقی پستی کا اُسے اتنا صدمہ ہُوا کہ اُس نے راہبانہ زندگی اختیار کی اور ایک غار میں گیان دھیان میں مگن رہنے لگا۔ سلطنتوں کے عرُوج و زوال کے مقابلہ میں یہ بات بہت معمُولی سی دکھائی دیتی ہے لیکن اس واقعہ نے مغرب کی مسیحیت میں بیداری کی ایک نئی رُوح پھونک دی۔ اس لڑکے کا نام بینیڈکٹ[3] تھا۔ وُہ راہب تھا اور اُس نے راہبانیت میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ راہبانیت کی تمام ترقی اُس کی مرہُونِ منّت ہے۔ اہل رُوما تخلیقی مفکّر نہیں تھے۔ وُہ نظم و ضبط میں مشہُورِ زمانہ تھے۔ اس تحریک میں بینیڈکٹ کا حصّہ خالص رُومی اقدار کا حامل تھا۔ اس سے پیشتر یہ تحریک خالصتاً قبطی اور یُونانی تھی۔ خانقاہی زندگی

[1] TOURS [2] PYRENEES [3] BENEDICT.

کی تین خصوصیات ہیں:-
اوّل غربت - دوم - پاکیزگی اور سوم - فرماں برداری -
بینیڈکٹ نے سب سے زیادہ فرماں برداری پہ زور دیا ہے -
کیسینو[1] ایک اُونچی پہاڑی ہے جو رُومہ سے جنوب مشرق میں واقع
ہے - اس مقام پر مشتری دیوتا کا مندر بنا ہُوا تھا - بینیڈکٹ نے
اس مندر کو گرا دیا اور اُسی مقام پر ایک خانقاہ قائم کی - اُس نے
اپنی روزمرہ کی زندگی سے عملی طور پر یہ دکھایا کہ ایک راہب کی
منظم زندگی کیا ہوتی ہے - رُومی نظم وضبط بڑا کرخت تھا لیکن
بینیڈکٹ کا ضابطۂ زندگی مسیحی ہمدردی اور فرد کے ساتھ محبت
کی وجہ سے بے حد نرم تھا - اُس نے ۵۲۹ء میں اپنے ضابطۂ
زندگی کی یُوں تعلیم دی کہ جس کا مقصد یہ ہے کہ "خُدا کی خدمت
کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا جائے اور ہمیں یقین ہے کہ وہاں کسی
قسم کی کوئی سختی روا نہیں رکھی جائے گی - راہبوں کو کُل باتوں
میں اپنے بزرگ راہب کو زبان انگریزی میں ایبٹ یعنی آبا یا باپ
کہا جاتا ہے لیکن بزرگ راہب کو عُمر رسیدہ راہبوں کے ساتھ اور
دیگر اہم معاملات میں ساری جماعت سے صلاح و مشورہ کرنے کی تلقین
کی جاتی ہے -

راہب سارا دن مشغولِ کار رہتے تھے کیونکہ کاہلی رُوح کی دشمن
ہے لیکن دن بھر کے فرائض میں بڑا ہی توازن تھا - بینیڈکٹ نے

۱ CASSINO.

ذیل کے پروگرام پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے:-
آٹھ گھنٹے سونا، ایک گھنٹہ کھانا کھانے کے لئے، سات گھنٹے
باورچی خانہ میں یا کھیتوں میں کام کرنا، چار گھنٹے عبادت کرنے، سونے
کے علاوہ باقی گھنٹوں کو دن اور رات کے دوران آٹھ وقفوں میں
تقسیم کیا گیا ہے - یہ "شرعی ساعتیں" ہیں - بینیڈکٹ کے اصول بہت
تھوڑے عرصہ میں مغربی خانقاہی نظام کے لئے معیار بن گئے اور
آج بھی یہی اصول رائج ہے -

اس کے ایک پُشت بعد ایک نوجوان امیر زادے نے جو رُومہ کا
چیف مجسٹریٹ تھا، اپنی خاندانی جائداد خانقاہیں قائم کرنے کے لئے
وقف کردی - ان خانقاہوں میں سے ایک میں وہ خُود راہب بن کر
رہنے لگا - یہ خانقاہ اُس جگہ قائم کی گئی تھی جہاں اُس کا گھر تھا - یہ
امیر زادہ گریگوری تھا جو ۵۹۰ء میں پوپ کے عہدہ جلیلہ پہ سرفراز
ہُوا - بینیڈکٹ کے حلقہ کے راہب کلیسا کے تنظیم یافتہ سپاہی تھے
اور گریگوری حکمت عملی اور فنِ حرب کا ایسا ماہر تھا جسے اس بات کا
علم تھا کہ ان تربیت یافتہ سپاہیوں کو کہاں کہاں استعمال کرنا چاہیئے -
گریگوری نے یورپ کی نومسیحی آبادی کو تلقین کی کہ وہ رُومہ کو
مسیحی دارالحکومت سمجھیں - یہ نومسیحی ہسپانیہ کے گاتھ[1]، اٹلی[3] کے لامبارڈ[2]
اور گال کے فرینک تھے - پادریوں اور راہبوں میں جو خرابیاں موجود تھیں
اُس نے اُن کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا اور اپنی توجہ اس طرف مبذول

۱ GOTA ۲ LAMBARD ۳ ITALY.

کی کہ لوگ کامل مسیحی بنیں۔ اُس نے انگلستان میں مسیحیت کی بشارت کا اہتمام کیا۔ یہ لوگ سلطنت کے وُہ حملہ آور تھے جو شمالی حصّوں میں آباد تھے لیکن ابھی تک بُت پرست ہی تھے جب اُسے مشنریوں کی ضرورت محسُوس ہُوئی تو اُس کی نگاہِ انتخاب اسی خانقاہ پر پڑی جہاں اُس نے خُود ہی تربیت حاصل کی تھی اُس نے ایک راہب بنام اگسٹین کو مُنتخب کیا، اور اُسے مشنری کا قائد مقرر کر دیا گیا۔ اُس نے سارے مُلک کو مُشرف بہ مسیحیت کرنے اور اُسے دو اسقفی حلقوں میں تقسیم کرنے کا منصُوبہ تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ بُت خانوں کو گرجوں میں اور غیر مسیحی تہواروں کو مسیحی تقاریب میں تبدیل کر دیا تھا۔ گریگوری رقمطراز ہے :-

"وُہ شخص جو کوئی بلند مرتبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، بتدریج اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا وُہ ایک ہی جُست میں منزلِ مقصُود تک نہیں پہنچ سکتا"۔

اب سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں بشارت کا پیغام کس طرح سے پہنچایا جائے؟ کینٹ[1] کے بادشاہ ایتھلبرٹ نے شہزادی برتھا[2] کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ شہزادی مسیحی تھی۔ اس زمانے میں انگلستان سات چھوٹی چھوٹی راجدھانیوں میں مُنقسم تھا اور کینٹ کی راجدھانی انتہائے جنُوب میں واقع تھی۔ گریگوری[3] کو ملکہ برتھا پر بھروسہ تھا کہ وُہ اپنی مملکت میں مشنریوں کو تبلیغ کی اجازت دے دی گی۔

[1] KING ETHELBERT OF KENT [2] BERTHA.
[3] GREGORY.

اکثر اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُس نے ایک مسیحی ملکہ کی خدمات سے استفادہ کیا۔ وُہ گال اور اٹلی کی ملکہ سے خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ اور اُن سے یہ توقع کیا کرتا تھا کہ وُہ اِن اصلاحی اور رفاہی کاموں میں اپنے اثر و رسُوخ کو استعمال کر کے اُن کی امداد کریں گی۔ تاجپوشی کی ایک عبادت گریگوری سے منسُوب ہے۔ اس میں یُوں مرقُوم ہے کہ جب ملکہ کے سر پر تاج رکھا جائے تو اُس وقت بشپ یہ دُعا کرے "خُداوند کریم ملکہ معظمہ کو یہ توفیق عطا فرما کہ وُہ وحشی قبائل کو سچائی سے رُوشناس کرائے"۔ گریگوری نے کئی دفعہ تجربہ کیا تھا کہ مذہبی معاملات میں خواتین نے اپنے اثر و رسُوخ سے کیا کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔

بادشاہ نے اگسٹین کو اجازت دے دی کہ وُہ کنٹربری کے سینٹ مارٹن[1] چرچ کو اپنی تحویل میں لے لے۔ یہ گرجا انگریزوں کی آمد سے پیشتر یہاں موجُود تھا۔ اس گرجا میں ۲ر جون ۵۹۷ء وِٹ سنڈے[2] کے روز یعنی ایسٹر کے بعد ساتویں اتوار کو بادشاہ کو بپتسمہ دیا گیا۔ یُوں جنُوبی انگلستان میں مسیحیت شروع ہُوئی۔

اس سے اگلے اتوار ۹ر جون کو سکاٹ لینڈ کے مغربی ساحل سے پرے آئی اونا[3] کے جزیرہ میں کیلٹک[4] مشن کے سب سے پہلے مشنری عمر رسیدہ کولمبا[5] کا انتقال ہُوا۔ ۴۳۲ء میں پیٹرک برطانیہ سے آئرلینڈ

[1] SAINT MARTIN [2] WHIT SUNDAY [3] IONA
[4] CELTIC [5] COLUMBA.

میں مسیحیت کا پیغام لے کر پہنچا۔ یہ انگریزوں سے پہلے کے زمانہ کا انگلستان تھا۔ کولمبا نے ۵۶۳ء میں آئرلینڈ سے سکاٹ لینڈ میں مسیحیت پھیلا دی۔ کیلٹک کے مشنریوں کی حمایت کرنے والا کوئی ایسا پوپ نہیں تھا جو سیاسی آدمی ہو۔ آئرلینڈ کا رُومہ کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا اور ان لوگوں کے پاس بشارت کا اپنا بھی کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ کولمبا کا سوانح نگار اُس کے متعلق یُوں رقمطراز ہے:-

"وُہ مسیح کی خاطر سفر اختیار کرنا چاہتا تھا۔"

بہت سے کیلٹک مشنریوں نے اِدھر اُدھر پھرنے والے سادھوؤں کی طرح بشارت دینی شروع کی۔ وُہ ایسے مشنری نہ تھے جن کے سامنے کوئی خاص مقصد ہو۔ کولمبا "آئی اونا" کے ساحل پر اُترا۔ اُن کے ساتھ بارہ چیلے بھی تھے۔ اُن کے ہم عصر کولمبنس[1] نے اسی طرح فرانس میں انجیل کا پیغام سنانا شروع کیا تھا۔ یہ دونوں بزرگ ہمارے خداوند اور اُس کے بارہ رسُولوں کے نمونہ پر عمل کر رہے تھے۔ ہمیں یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ وُہ بے مقصد اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔

آئی اونا کے جزیرے میں کولمبا نے اپنی خانقاہ تعمیر کی۔ یہ خانقاہ چند سادہ سی جھونپڑیوں پر مشتمل تھی۔ اس خانقاہ میں کولمبا اور اُس کے چیلے کھیتی باڑی اور ماہی گیری کا کام کیا کرتے تھے۔ وُہ کتابوں کے مطالعہ میں اپنا وقت صرف کرتے اور کتابوں کو نقل کرنے میں لگے رہتے تھے۔ اس طرح سے کتابوں میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ وقت مقررہ پر

[1] COLUMBANUS.

نماز ادا کی جاتی تھی۔ اسی مرکز سے انہوں نے مشنری سفر کیے اور بعض اوقات جو راہب پیچھے رہ جاتے تھے، وُہ کوئی نئی خانقاہ تعمیر کر لیتے تھے۔ ان خانقاہوں میں سے سب سے زیادہ مشہور خانقاہ نارتھمبریا[1] ہی میں تھی۔ نارتھمبریا انگریزی مملکتوں میں سے دُور شمال مشرق میں واقع تھی۔ نارتھمبریا کا بادشاہ اپنے دشمنوں سے جان بچا کر بھاگا تھا اور اُس نے راہبوں کے ساتھ آئی اونا کے جزیرے میں پناہ لی تھی۔ جب اس بادشاہ نے دوبارہ اپنی کھوئی ہُوئی سلطنت کو حاصل کر لیا تو اس نے اپیل کی کہ اس کی مملکت میں مشنری بھیجے جائیں۔

۶۳۵ء میں ایڈن[2] یہاں پہنچا۔ بادشاہ نے اُسے ایک چھوٹا سا جزیرہ عطا فرمایا تاکہ وُہ اُسے "آئی اونا" ثانی بنا دے۔ اس جزیرے میں مد و جزر اصغر کے وقت پانی میں چل کر بھی جا سکتے ہیں۔ آج تک اسے مقدس جزیرہ ہی کہا جاتا ہے۔ بیڈ نے (۶۷۳ء تا ۷۳۵ء) نے اس کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے:-

"بادشاہ اپنے مصاحبین اور اُمراء وزراء کو خدا کا کلام سُناتا تھا، کیونکہ اپنی جلاوطنی کے دوران اُس نے سکاٹ لینڈ کے لوگوں کی زبان پر کامل عبور حاصل کر لیا تھا۔"

انگلستان کے بہت بڑے حصہ نے مسیحیت کو قبول کر لیا لیکن جنُوب کی طرف سے آنے والے بنیڈکٹ کے حواریوں کی مساعی جمیلہ سے ایسا نہیں ہُوا بلکہ شمال کی طرف سے آنے والی تبلیغی مشن کی کارگزاریاں

[1] NORTHUMBRIA [2] AIDAN.

بارآور ہوئیں۔ سنہ ۶۶۴ء میں انگلستان کی کلیسیا نے فیصلہ کیا کہ رُوم کے ساتھ تعلقات قائم رکھے جائیں۔ اب انگلستان کیلٹک تہذیب و تمدن کی بند کھاڑی کے بجائے یورپین زندگی کے وسیع و عریض سمندر میں تھا۔ اس سے نہ صرف انگلستان کو فائدہ حاصل ہُوا بلکہ اس سے یورپ بھی بہُت مستفید ہُوا۔

انگلستان کو اس سے جو فائدہ ہُوا اس کے آثار جلد ہی ظاہر ہونے لگے۔ سنہ ۶۶۸ء میں پوپ نے کنٹربری میں ایک آرچ بشپ کو بھیجا جس نے ایک اُسقفی حلقہ کی تنظیم کو تقویت دینے میں بڑی امداد فرمائی۔ جس زمانے میں کیلٹک کے راہب اس حلقہ کے نظم و نسق کے ذمہ دار تھے اُس وقت اس کی حالت بہُت کمزور تھی۔ آرچ بشپ کی اس مثال سے صاف ظاہر ہے کہ اوّل کلیسیا قوم کی کیا خدمت کر سکتی ہے اور دوم یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ کلیسیا عظیم قومی کردار کی حامل ہے۔

بیڈ ل اس کے بارے میں یُوں لکھتا ہے "یہ پہلا آرچ بشپ تھا جس کے فرمان کو کُل انگریز کلیسیا بجا لاتی تھی"۔ اس کے پُورے اڑھائی سو ۲۵۰ سال بعد قومی اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر ہُوا۔ انگلستان کی کلیسیا نے انگریز قوم کے اتحاد کا راستہ ہموار کیا۔ لیکن یہ بات بڑی ہی حیران کن ہے کہ وُہ آرچ بشپ جس کی کوششوں سے یہ اتحاد حقیقت بن گیا، وُہ ترسس کا باشندہ تھیوڈور یُونانی تھا۔ وُہ مُقدّس پولُس رسُول کا ہموطن تھا۔ آرچ بشپ تھیوڈور کا معاون ایبٹ ہیڈریان ع افریقی تھا۔ اُس کا

ل BEDE ع ABBOT HADRIAN.

وطنِ مالُوف تیونس تھا۔

انگلستان نے یورپ کو بڑا ہی فیض پہنچایا۔ یہ فیض اُسے انگریز مشنریوں کی معرفت نصیب ہُوا۔ ایک صدی کے اندر اندر انگلستان مشنریوں کی جولانگاہ نہ رہا۔ اب اس جگہ سے مشنری شمالی یورپ میں مسیحیت کی بشارت دینے کے لئے بھیجے جانے لگے۔ سنہ ۶۹۰ء میں ولیبرڈ ل اور ریپن کی خانقاہ کے گیارہ راہب نیدرلینڈ کی طرف روانہ ہُوئے۔ پس اس دفعہ رسُولوں کی طرح اس جگہ بھی بشارت کے لئے مشنری روانہ ہُوئے۔ اگرچہ اس دفعہ رسُولوں کی طرح نہ وہ بادہ تھے اور نہ ہی اُن کا کوئی رہنما تھا۔ ولیبرورڈ کو کولمبا کی نسبت اپنے بشارتی علاقہ کا زیادہ علم تھا۔ اُس کے سامنے ایک خاص مقصد بھی تھا۔ اہلِ گال اپنی سلطنت کو مشرق کی طرف وسیع کر رہے تھے یعنی وُہ از سرِ نو اُس سرزمین کی طرف جا رہے تھے جہاں سے دو سو ۲۰۰ سال ہُوئے اُن کے آبا و اجداد آئے تھے۔ اہلِ گال نے ولیبرورڈ کی پُورے پچاس سال تک ہر طرح سے امداد اور سرپرستی کی اور اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اس مُلک میں کلیسیا مُستحکم ہو گئی ہے۔ اُسے نیدرلینڈ کا رسُول کہا جاتا ہے اور وُہ اس مُلک کا مرتی سینٹ ہے۔

کریڈیٹن ع کا بونی فس س ایک بہُت بڑا مشنری تھا۔ وُہ ونچسٹر ق کے قریب ایک خانقاہ میں رہا کرتا تھا۔ سنہ ۷۱۶ء میں وُہ اسی خانقاہ سے انجیل کی خدمت کے لئے روانہ ہُوا۔ اس وقت اُس کی عُمر چالیس برس

ل WILLIBRORD ع CREDITION س BONIFACE
ق WINCHESTER.

کی تھی۔ وہ بڑا عالم تھا۔ کلیسیا میں اُس کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ اُسے
اپنی خانقاہ کا ایبٹ بننے کی پیش کش کی گئی۔ وہ فطرتاً مہمات کا شائق
تھا۔ اُسے محض نئے نئے ممالک کی سیر و سیاحت کا ہی سودا نہ تھا جس
کی وجہ سے اُس نے بشارت کی خدمت کا بیڑا اُٹھایا تھا بلکہ اُس کے
پیچھے ایک اور جذبہ کار فرما تھا۔ اُس میں صحیح مشنری رُوح تھی۔
اسی لیے اُس نے دُنیاوی جاہ و جلال کی پروا نہ کی اور اپنے وطن
کو خیرباد کہا، اور نیدرلینڈ کی طرف چلا آیا۔ تھوڑی دیر تک اُس نے
ولیبرورڈ کے ہاں تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد وہ جنوب اور وسطی
جرمنی میں پہنچے۔ اس زمانہ میں یہ علاقہ بھی اہلِ گال کی مملکت میں
شامل ہو رہا تھا۔ اس جگہ مسیحیت موجود تو تھی لیکن بڑی بے جان تھی
اور اس میں تنظیم کا فقدان تھا۔ بونی فیس کے دل و دماغ کی قوتیں
دو حصوں میں بٹ گئیں۔ وہ اُن لوگوں میں اصلاح کرنا چاہتا تھا جو
مسیحی تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ بُت پرستوں کو بھی انجیل کا پیغام
سُنانا چاہتا تھا۔ مسیحیوں میں اصلاح کی خاطر تو پوپ نے اُنہیں دعوت
دی تھی لیکن وہ بُت پرستوں میں مُنادی کے بڑے ہی شائق تھے جب
وہ گیسمر میں تھے تو اُنہوں نے ۷۲۳ء میں ایک پُرانے بلوط کے درخت
کو کاٹ ڈالا۔ یہ درخت دیوتاؤں کی نگاہ میں بڑا ہی مقدس تھا،
اور سب بُت پرست اس انتظار میں تھے کہ آسمان سے بجلی گر کر اُسے
بھسم کر دے گی لیکن اس کے بجائے یہ ہُوا کہ بونی فیس نے کلہاڑے

---
۱ BONIFACE ۲ GEIOMAR ۳ FULDA.

کی پے در پے ضربات سے درخت کو کاٹ ڈالا اور وہ درخت ہوا
کے ایک جھونکے سے دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ اُنہوں نے اس
لکڑی سے ایک چیپل تعمیر کیا۔ اس سے وسطی جرمنی میں غیر مسیحی مذہب
کا زوال مُراد ہے۔ بونی فیس کا طریق کار یہ تھا کہ وہ بُت پرستوں میں
خانقاہیں قائم کیا کرتا تھا اور یہ خانقاہیں اُن لوگوں میں مشنریوں کے
ٹھکانے تھے۔ اِن خانقاہوں میں سے بعض بڑی خانقاہیں بن گئیں۔
ان میں سے ایک فُلڈا کی خانقاہ تھی جس میں بونی فیس کو دفن کیا گیا تھا۔
جب بونی فیس ۸۰ برس کا ہُوا تو وہ مینز کا آرچ بشپ تھا۔ وہ
ریٹائر ہو گئے لیکن وہ آرام کی خاطر ریٹائر نہیں ہوئے تھے۔ اُن
کا مقصد نیدرلینڈز میں واپس جانے کا تھا کیونکہ یہی اُس کا مشن فیلڈ
تھا جہاں اُس نے بشارت کا کام شروع کیا تھا۔ ۵ جون ۷۵۴ء کو وہ
مشنری دورہ کر رہا تھا۔ وہ چند لوگوں کو مستحکم کرنا چاہتا تھا جنہیں اُس
نے ابھی ابھی مسیحی کیا تھا۔ اچانک مسلح آدمیوں کے ایک دستہ نے
اُس پر حملہ کر دیا۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد ایک مُعمّر خاتون نے اس
واقعہ کی روئیداد بیان کی کہ جس وقت یہ حادثہ ہُوا وہ ایک کمسن لڑکی
تھی۔ صاحبِ موصوف کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ وہ اسے پڑھ
رہا تھا۔ اُس نے اس کتاب کو اپنے سر کے اُوپر رکھ لیا اور ایک
آدمی نے اُس پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ وہ زمین پر گر پڑا اور تلوار اُس
کتاب کے ۴۰ صفحوں کو کاٹتی ہوئی گہری چلی گئی۔ اس کتاب پر اُس

---
۱ FULDA. ۲ MAINZ. ۳ NETHERLANDS,

کے خون کے قطروں کے نشان ہیں اور یہ ابھی تک فلاں کی قدیم تاریخی چیزوں میں رکھی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں میلان کے سینٹ ایمبروز[1] کے دو وعظ موجود ہیں۔ ایک وعظ روح القدس کے متعلق ہے اور دوسرے کا عنوان یہ ہے "مرنا کتنا اچھا ہے"۔ بونی فیس پہلا وعظ اس لئے پڑھ رہے تھے تاکہ وہ اپنے آپ کو مستحکم ہونے کے لئے تیار کرے اور دوسرا وعظ بھی شخصی تیاری کے لئے تھا۔

بادشاہ چارلے مین[2] کے زمانہ میں اہلِ گال کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ اس بادشاہ کا زمانہ سنہ ۷۶۸ء تا ۸۱۴ء ہے۔ اہلِ گال نے مشنریوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی تاکہ وہ اُن کے نئے نئے مفتوحہ علاقوں میں انجیل کی منادی کریں۔ بادشاہ چارلے مین نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا۔ جب اس نے سیکسنی[3] کو فتح کیا تو اہلِ سیکسن کو بپتسمہ لینے پر مجبور کیا۔ تاریخ میں یہ جبر و اکراہ بپتسمہ دینے کا یہی پہلا تحریری واقعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جہالت کی بہت سی باتیں کلیسیا میں داخل ہو گئی تھیں۔ رُوم کی مغربی سلطنت کے خاتمہ کے بعد چارلے مین کی سلطنت ہی ایسی سلطنت تھی کہ ایک بڑا وسیع علاقہ ایک بادشاہ کے زیر نگین ہوا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ایک مسیحی سلطنت بحال ہو گئی۔ لہٰذا اس سلسلہ میں سنہ ۸۰۰ء میں بڑے دن کے مقدس تہوار پر پوپ نے چارلے مین کی تاجپوشی کی رسم ادا کی اور اسے رُومیوں کا شہنشاہ قرار دیا۔ لیکن رُوم کی مشرقی سلطنت ان اقدام کو پسند قطعاً

نہیں کرتی تھی کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اس قسم کے اقدام سے مغربی سلطنت سے دھوکا کیا گیا تھا۔

اگلے ڈیڑھ سو برس تک مغرب میں جہالت کا بہت زیادہ دور دورہ رہا۔ اس کی چار مثالیں ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۔ سلطنت:۔ سنہ ۸۴۳ء کے بعد چارلے مین کی سلطنت بٹ گئی اور کوئی ایسی ہستی پیدا نہ ہوئی جو سلطنت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو اکٹھا کر کے اُسے اپنے زیر نگین رکھتی۔ ایک صدی بعد تک بھی کوئی قابلِ ذکر شہنشاہ پیدا نہ ہوا۔

۲۔ پاپائی نظام:۔ زمانہ جہالت کی تاریکیاں کلیسیا کے مرکز تک پہنچ چکی تھیں۔ پاپائی نظام کی پشت پناہی پر کوئی مسیحی سلطنت نہ تھی۔ اب پوپ بننے کے لئے ایسے لوگ بھی تگ و دو کرنے لگے جو اس عہدۂ جلیلہ کے ہرگز ہرگز قابل نہ تھے اور جو لوگ پوپ بنے وہ محض جاہ و جلال اور دولت کی خاطر اس عہدے سے چمٹے رہے۔ انہوں نے خوب عیش و عشرت کی کیونکہ وہ کلیسیا کی کوئی خدمت بجا لانے کے خواہاں نہ تھے۔ سنہ ۸۵۵ء تا ۹۵۵ء یعنی ایک سو سال کے عرصہ میں ۲۷ پوپ ہوئے۔ یہ بڑی سُرعت سے بدلتے گئے۔ اس کی خاص یہ وجہ تھی کہ یہ سازشوں اور تشدد کا دور دورہ تھا۔

۳۔ نارتھ مین[1]:۔ نویں صدی میں سکینڈے نیویا[2] کے بحری قزاقوں نے ساحلی علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ خاص طور

پر شمالی یورپ اُن کا تختۂ مشق بنا رہا۔ وُہ گرجوں اور خانقاہوں کو لُوٹتے تھے۔ اِن کا سب سے بڑا جُرم شاید یہ تھا کہ اُنھوں نے اُس مسیحی آئرش تہذیب کو تباہ کر دیا جس نے یورپ کی ترقی میں بہُت اہم کردار ادا کیا تھا۔ شمال کی طرف سے آنے والے اِن حملہ آور قزاقوں کا جمِ غفیر مشرقی انگلستان میں آباد ہوگیا۔ اِس علاقے کو ڈین لا[1] کہا جاتا تھا۔ کچھ قزاق شمالی فرانس یعنی نارمنڈی میں بسنے لگے۔

۴۔ اہلِ ہنگری۔ مسیحی سلطنت کی مشرقی سرحد پر غیر مسیحی لوگ بھی آباد تھے۔ لیکن وُہ تمدن اور ثقافت میں بہُت پیچھے تھے۔ اِن میں سلاوز[2] شمار میں زیادہ تھے لیکن اہلِ ہنگری بڑے بہادر تھے۔ اُنہیں فتح کرنا آسان نہ تھا۔ سنہ ۹۰۰ء کے قریب منگول گھوڑ سواروں کی فوجِ ظفر موج ہُن قوم کی طرح وسطی یورپ اور بلقان کے لئے زبردست خطرے کا باعث بنی ہُوئی تھی۔

اِس باب کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ تنزل کا یہ زمانہ سنہ ۹۵۰ء کے قریب ختم ہوگیا تھا۔ غالباً یہی وُہ وقت تھا، جب ان چار صُورت حالات میں کسی بہتر چیز کا وعدہ موجود تھا۔

(ا) سلطنت۔ چارلے مین فرینک تھا جس نے جرمنی کو فتح کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مغربی جرمنی کے اس علاقہ میں جہاں فرانسیسیوں کو اقتدار حاصل تھا وہاں نوآبادیات اور ماتحت

[1] DENELAW. [2] SLAVS.

رکھنے کی پالیسی نے فروغ حاصل کیا۔ لیکن یہ درست نہیں ہے دراصل یہ سب کچھ مشرقی حصّہ میں ہُوا، جسے جرمن علاقہ کہا جاتا تھا اور اِس امر کو اُس وقت تسلیم کیا گیا جب سنہ ۹۶۲ء میں پوپ نے اوٹو اول[1] کی تاجپوشی "رُومی شہنشاہ" کے نام سے کی۔

(ب) پاپائی نظام:۔ خانقاہوں اور کلیسیائی نظام کو بہتر بنانے کے لئے ایک تحریک سر اُٹھا رہی تھی۔ اس تحریک کا مرکز کلنی[2] تھا۔ اِس خانقاہ کی بُنیاد سنہ ۹۱۰ء میں رکھی گئی۔ سنہ ۱۰۴۷ء سے پوپوں کی جانشینی کا سلسلہ شروع ہُوا۔ پوپ اپنے عُہدہ کو بڑا ہی بلند اور پُر وقار سمجھتے تھے۔

(ج) نارتھ مین:۔ شہنشاہ آٹو کی تاجپوشی کے بعد سنہ ۹۶۲ء میں ایک بڑا عالی وقار نارتھ مین پیدا ہُوا۔ اُن کا اسمِ گرامی اولف ٹرائیگریسن[3] تھا۔ اُنھوں نے انگلستان پر لشکر کشی کی اور مسیحی مذہب کو قبول کیا۔ جب وُہ اِس حملہ کے بعد ناروے پہنچا تو وُہ ناروے اور شمال کے دیگر علاقوں کا بھی مسیحی بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔

(د) اہلِ ہنگری۔ شہنشاہ اوٹو نے اِن قزاقوں کو سنہ ۹۵۵ء میں شکست دی اور اس طرح سے وسطی یورپ کو اِن سے نجات دلائی۔ بہُت سے مشنری ہنگری میں آگئے۔ بہُت سے اُمرا و رؤسا نے مسیحی مذہب قبول کر لیا۔ اُن اُمرا میں سے سب سے زیادہ قابلِ ذکر شخص گیسا[4] تھا (وفات سنہ ۹۹۷ء)، اس کے عہد میں اہلِ ہنگری

[1] OTTO I [2] CLUNY. [3] OLAF TRYGGRASON [4] GEISA.

ایک قوم کی حیثیت سے ترقی کرنے لگے۔ سنہ ۱۰۰۰ء میں گیسا کے بیٹے کو شاہی تاج پیش کیا گیا۔ پوپ سلیفسٹر اوّل نے اس بادشاہ کی خدمت میں خود تاج بھیجا۔ ہنگری کا یہ پہلا بادشاہ اس ملک کا مربی سینٹ کہلانے لگا۔ سنہ ۹۵۵ء کے قریب حالات نے پلٹا کھایا۔

دوم - سلاوز کا مسیحی مذہب قبول کرنا۔

رومیوں کی مشرقی (بازنطینی) سلطنت اور کلیسیا کے یونانی فرقے کو پانچویں صدی میں جرمن قبیلوں کی ہجرت کی وجہ سے مغرب کی نسبت کم نقصان اُٹھانا پڑا۔ لیکن ساتویں صدی میں ظہورِ اسلام کے وقت اُنہوں نے سب سے زیادہ نقصان برداشت کیا۔ وہ مشرق اور جنوب میں عرب سلطنت سے گھر سے ہُوئے تھے اور وہ صرف شمال کی طرف ہی بڑھنے کے قابل تھے۔ شمال کی طرف سے خاکنائے بلقان کی طرف مہاجرین کا ایک زبردست ریلا آرہا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر سلاوز تھے۔ ابتدائی جرمنوں کی طرح ان آباد ہونے والے لوگوں کو شاہی فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ اُنہوں نے یُونانی تہذیب کو اپنا لیا اور اکثر اوقات اُن کے رہنما اس سلطنت کے مذہب کے بارے میں سُننا پسند کیا کرتے تھے۔

سلاوز کے درمیان کام کرنے والے دو مشنریوں کا نام زندۂ جاوید رہے گا۔ یہ مشنری سگے بھائی تھے۔ اُن کی جائے ولادت تھسلنیکے تھی۔ ایک بھائی کا نام کانسٹنٹائن اور دوسرے کا میتھوڈیس؎ تھا۔ راٹسلاؤ؎

؎ METHODIUS ؎ RATISLAV.

ایک شہزادہ تھا۔ وہ موراویا؎ باشندہ تھا۔ اُس نے قسطنطنیہ میں شہنشاہ کے حضور ایک درخواست گذاری کہ ان کے لئے چند مشنری بھیج دیئے جائیں۔ سنہ ۸۶۲ء میں اُس کی درخواست کو قبول کیا گیا۔ اس علاقہ میں جرمن مشنری کام کر رہے تھے اور ان کا بڑا اثر و رسُوخ تھا۔ جرمن مشنری مغرب کی کلیسیا کے نمائندے تھے۔ یہ دونوں یُونانی بھائی ایسے خیالات کی تبلیغ کرنے لگے جو بالکل اُلٹے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان دونوں بھائیوں کو جنوبی روس کے علاقے میں کام کرنے کا تجربہ تھا۔ اُنہوں نے سلاوز کے لئے وُہی کچھ کرنے کا بیڑا اُٹھایا جو الفیلاس نے جرمنوں کے لئے کیا تھا۔ اُنہوں نے سلاوز کی زبان کا رسم الخط ایجاد کیا۔ عجیب بات ہے کہ جرمنوں نے سلاوی طرزِ نماز کی مخالفت کی۔ کلیسیا کے اس حصہ کو جسے لاطینی کہا جاتا ہے، ترجمہ کے معاملہ میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کلیسیا کے ابتدائی زمانہ میں اس طرف بہت زیادہ توجہ دی گئی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ لاطینی زبان ایسی زبان ہے جس میں بائبل مقدس کا ترجمہ ہونا چاہیئے اور اسی زبان کی طرزِ عبادت بہتر ہوگی کیونکہ یُونانیوں نے اُسے اپنا لیا تھا۔ چنانچہ دونوں بھائیوں کو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ وُہ پوپ کی منظوری اور اجازت حاصل کرنے کی غرض سے رُوما میں پہنچے کانسٹنٹائن نے سنہ ۸۶۹ء میں وفات پائی۔ میتھوڈیس واپس آیا اور اُس نے موراویا میں تبلیغ کی۔ اُسے بشپ بنا دیا گیا اور وُہ بعد ازاں آرچ بشپ کے

؎ MORAVIA

کے عُہدہ پر سرفراز ہُوا۔ اُس نے سلاوی زبان میں بائبل مُقدّس کا ترجمہ مکمّل کیا۔ اس طرح یُونانی کلیسیا کے دو مشنریوں کا لاطینی کلیسیا کے ساتھ تعلّق ہُوا اور اُنہوں نے اِس کلیسیا میں سلاوی کلیسیا کی بُنیاد ڈالی۔ آخر میں لاطینی کلیسیا کی سخت رسُومات کی موجودگی میں فتح ہُوئی لیکن سلاوی مسیحی اِن دونوں مشنری صاحبان کے بڑے ہی احسان مند تھے، اُنہوں نے اُن کی زبان میں بائبل مُقدّس اور نماز عطا کی۔ یہ ایک مُسلّمہ حقیقت ہے کہ یہی مشنری لوگ اِن کے تمام علم و ادب کے بانی تھے۔

لیکن اسی زمانہ میں یُونانی کلیسیا میں جنُوب کے رہنے والے سلاونز شامل ہو رہے تھے۔ اُنہیں بلقان کے سربیائز کہا جاتا ہے۔ بلگیریا میں بھی یُونانی کلیسیا بڑی ہردلعزیز تھی۔ اِس جگہ آبادی زیادہ تر سلاویوں پر مشتمل تھی۔ جرمنی اور بازنطینی سیاسی قوتیں بلگیریا کے لوگوں کو مسخر کرنے میں ایک دُوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں اور بعینہٖ مذہب کے میدان میں لاطینی اور یُونانی کلیسیا سرگرم عمل تھیں۔ اُن کے بادشاہ کا رُجحان کبھی ایک کلیسیا کی طرف تھا اور کبھی دُوسری کی طرف۔ لیکن آخرکار ۸۷۰ء میں بلگیریا نے ہمیشہ کے لئے یُونانی کلیسیا کی سیادت کو قبُول کر لیا۔ اِن خادمانِ دین کو جنہیں سلاوی زبان کے خلاف ہونے کی وجہ سے مُلک بدر کر دیا گیا تھا اب واپس بلگیریا میں پھر بُلا لیا گیا۔ اس طرح میتھوڈیس نے جو کام شرُوع کیا

لے JEPEPANE

تھا وُہ از سرِ نو اُسی کلیسیا میں شرُوع ہُوا جس کے ساتھ اُس کا تعلّق تھا۔ بادشاہ نے میتھوڈیس کی امداد فرمائی اور اُس کی کوشش بارآور ہُوئی اور مسیحیّت سلاوی رنگ میں جلوہ نما ہُوئی۔

۹۵۴ء میں آرچ ڈیوک آف کیوؔ کی بیوہ نے بپتسمہ لیا۔ اس واقعہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دُوسرے اہم واقعات کی طرح جن کا ذکر پیشتر ازیں ہو چُکا ہے، ایک بڑی اہم بات رُونما ہُوئی جس نے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔ یہ معزز خاتُون ولاڈیمیرؔ کی دادی تھی۔ محض اسی کے اثر و رسُوخ کی بدولت اِس آرچ ڈچی نے مسیحیّت کو سرکاری مذہب کے طور پر قبُول کیا اور کیئو کی آرچ ڈچی تھی وہ ریاست تھی جو آئندہ سالوں میں رُوس کے نام سے ترقّی کی مُنازل طے کرنے لگی۔ کلیسیائے جامع کا یُونانی حصّہ مغرب کے لاطینی حصّہ سے علیحدہ ہو گیا تھا اور اس کے مشرق اور جنُوب میں مذہب اسلام کارفرما تھا تاہم کلیسیا کے لئے ترقّی کی نئی راہیں کُھل رہی تھیں کیونکہ اس کے سامنے ایک مشہُور و معروف علاقہ تھا، جہاں مشنری سرگرمیوں کے لئے بڑی گنجائش تھی۔

سوم :- ایشیاء میں مسیحیّت کی اشاعت

کاسمس نے ۵۲۲ء کے ہندوستان اور لنکا کے متعلق جو شہادت قلمبند کی ہے ہم نے اُس کا جائزہ لیا ہے اور مشرق کی طرف مسیحیّت کی روز افزوں ترقّی کے موضُوع پر غور و خوض کو اسی مقام تک محدُود رکھتے ہیں۔ ۳۴۵ء میں ایرانی مسیحی ہجرت کر کے مالابار کی طرف آنے لگے مسیحیوں

ے VLADIMIR

کی یہ جماعت کوئیلن[1] پہنچی۔ ان کے قائد مار[2] وان صابر ِشو تاجر اور دو بشپ تھے جن کے نام مار ساپور اور مار اپروت[3] تھے۔ جنوبی ہندوستان میں ابھی تک تانبے کی وہ تختیاں موجود ہیں جن پہ اس غیر ملکی جماعت کو اس ملک میں رہنے کا اجازت نامہ کندہ ہے۔ یہ مسیحی چیزوں کے ناپ تول کے معیاری پیمانوں کی چھان بین پر مامور تھے۔ انہیں بہت سی مراعات حاصل تھیں اور کئی قسم کے ٹیکس اور محصول معاف تھے۔ وہ تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ اس قسم کی مراعات سے مسیحیوں کے وقار میں یقیناً اضافہ ہوا لیکن وہ اپنے آپ کو ایک ایسی جماعت تصور کرنے لگے جسے بہت سی سہولتیں میسر تھیں۔ اس لئے اس میں دیگر لوگ شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ مائلا پور میں مقدس تُوما رسول کے مزار پر ۱۵۴۶ء میں پتھر کی ایک صلیب بنائی گئی۔ یہ صلیب سنگ تراشی کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس پر پہلوی زبان میں لکھا ہے کہ افراس نے یہ صلیب تراشی تھی۔ افراس چہار بخت سُریانی کا بیٹا تھا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ افراس اور اپروت ایک ہی نام ہے۔

مسیحیوں نے نہ صرف بحیرۂ عرب کو عبور کر کے دوسرے ممالک کا

[2] لفظ مار کے معنی آقا یا خداوند ہے اور بشپوں کے نام کے پہلے استعمال کیا جاتا ہے جس طرح انگریزی میں لارڈ بشپ کہا جاتا ہے۔ خلیق

[1] QUILON [2] MARWAN SABIRISHO [3] MARSAPOR
[4] MARAPROT

سفر اختیار کیا تھا بلکہ وہ خشکی کے راستے مشرق کی طرف بھی بڑھ رہے تھے۔ اب وہ نہ صرف تجارتی اغراض کے لئے بلکہ مسیحیت کی تبلیغ کے لئے دوسرے ممالک میں جاتے تھے۔ ہم پڑھتے ہیں کہ ۵۲۰ء کے قریب مشرق کی کلیسیا کے بہت سے مشنری ہُن قوم کے ساتھ باختریہ میں رہنے لگے۔ کلیسیا نے یہاں کے لوگوں کو اُن کی زبان میں رسم الخط عطا کیا۔ اس سے پیشتر ان لوگوں کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں تھا۔ سُریانی حروف کا استعمال کیا گیا۔ منگول اور منچو اثرات کے پیچھے سُریانی اثرات کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔ اس طرح نہ صرف شمالی یورپ اور سلاوی قوم کے لوگ رسم الخط کے لئے احسان مند ہیں بلکہ ایشیا کے بہت سے حصص بھی اس کے مرہونِ منت ہیں۔ ۵۵۰ء میں کیتھولی کوس کے مقام پہ باختریہ کے ہُن لوگوں کے لئے ایک بشپ کو مخصوص کیا۔ سُریانی روایت میں مرقوم ہے کہ سفارت خانے کی معرفت شہنشاہ ایران سے درخواست کی گئی۔ شہنشاہ خداوند یسوع کی قوت سے حیران تھا کہ مسیحی ہُنوں نے کیتھولی کوس کو اپنا قائد تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے ایک صدی بعد کلیسیا کے سربراہ کے مندرجہ ذیل اختیارات تھے۔

"مشرق میں بیس بشپ اور دو آرچ بشپ — کئی سالوں سے کوئی ہمارے پاس نہیں آیا۔ لیکن ہمیں علم ہے کہ فاصلے کے باوجود وہ اپنے فرضِ منصبی کو پورا کرتے ہیں۔ ہم انہیں خطوط لکھتے ہیں اور وہ ہم سے خط و کتابت کرتے رہتے ہیں۔"

عین اُسی وقت چین میں سانگ خاندان کا اقتدار وسطی ایشیا کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں پھیل رہا تھا۔ یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ ایسے مشنری جو ایران کے مشرق میں بشارت کی خدمت سرانجام دے رہے تھے، امیروں، سفیروں، تاجروں اور طالب علموں کے ہمسفر ہو کر اور پہاڑوں اور ریگستانوں کو عبور کر کے چین کے دارالحکومت چانگ آن[۱۹] میں آیا کرتے تھے۔ ۱۶۲۵ء میں سنگِ خارہ کی ایک نو فٹ لمبی سِل زمین سے ملی ہے جس پر ایک صلیب کندہ ہے اور اُس کا عنوان ہے "چین میں مشہور سریانی مذہب کے پھیلنے کی یاد میں یہ تختی نصب کی جاتی ہے" (یہ مذہب مسیحیت ہے)۔ وہ صلیب جو ہندوستان میں ملی ہے اس پر اُس کی نسبت بہت زیادہ عبارت مرقوم ہے۔

"سیریا (علاقہ ایران) میں الوپن[۲۰] نامی ایک بشپ تھا۔ اُس نے سفر کی بہت سی مصیبتیں اُٹھائیں اور چن کوآن[۲۱] کے نویں مہینے (۶۳۵ء) میں چانگ آن پہنچا۔ شہنشاہ نے اُسے شاہی مہمان کی حیثیت سے اپنے محل میں اُتارا۔ شہنشاہ کے دارالمطالعہ میں مقدس صحیفوں کا ترجمہ کیا گیا اور شہنشاہ نے شریعت کے احکام پر اچھی طرح سے غور و فکر کیا۔ اُسے معلوم ہوا کہ یہ احکام راست ہیں، اس لئے شہنشاہ نے ان کی اشاعت کا فرمان جاری کیا۔"

مذہبی رواداری کے اس فرمان کا ذکر جو اس تختی پر مرقوم ہے، سرکاری

---

[۱۹] CHANG AN [۲۰] ALOPEN [۲۱] CHANG-KUAN.

تواریخ میں بھی آتا ہے۔ شہنشاہ نے اپنے دارالحکومت میں اُنہیں ایک خانقاہ عطا فرمائی جس میں اکیس[۲۱] راہبوں کے رہنے کی گنجائش تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگلے بادشاہ کے عہدِ حکومت میں بہت سی خانقاہیں تعمیر کی گئیں۔ ۸۴۵ء کے قریب چین کے مسیحیوں کو ناپسند کیا جانے لگا۔ جب مسیحیت اس مُلک میں آئی تھی تو اُسے اس وجہ سے برداشت کر لیا گیا تھا کہ یہ مذہب ایران سے آیا ہے۔ عربوں نے مدت تک ایران کو تاخت و تاراج کیا۔ ایران کے آخری خاندان یعنی ساسانی خاندان نے چین میں پناہ لی ہوئی تھی۔ ۶۷۷ء میں اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ ایران کا تو خاتمہ ہو چکا تھا اس لئے چینیوں نے سمجھا کہ ایرانی مسیحیت کی کوئی وُقعت نہیں رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان خلیفہ کی حکومت میں مسیحیوں کو کوئی آزار نہیں پہنچا۔ اس نئی عرب ریاست میں مسیحی تہذیب و تمدن کے ذمہ دار تھے اور بغداد کے دارالخلافہ میں وہ کلیدی عہدوں پر فائز تھے اور خلیفہ کے معتمد علیہ تھے۔ ہم پڑھتے ہیں کہ ۷۳۲ء میں خلیفہ کی طرف سے جو سفارت چین میں بھیجی گئی اُس کے ساتھ ایک بشپ بھی تھا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد چین کے شہنشاہ نے کلیسیا کی سرپرستی کی تجدید کی اور اس کا سرکاری "نام" تبدیل کر دیا۔ یعنی "ایرانی" (جو اب ختم ہو چکا تھا) کی جگہ اُسے "مشہور سُریانی مذہب" کا لقب دیا۔ یہ تختی ۷۸۱ء میں نصب کی گئی اور اس میں مسیحیت کے نیک اثرات پر اعتماد کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس پر مرقوم ہے،

۱۔ اگر سلطنت میں امن و امان ہے۔
۲۔ اگر عوام نیک کام کرنے کے قابل ہیں۔
۳۔ اگر لوگ خوشحال زندگی بسر کر سکتے ہیں۔
۴۔ اگر مُردے خوشی کرنے کے قابل ہیں۔

تو یہ سب کچھ ہمارے مشہور سُریانی مذہب کے کارہائے نمایاں اور محنت کا نتیجہ ہے۔ اس میں خاص طور پر بلخ کے ایک مسیحی کا ذکر ہے جو شاہی دربار میں عہدہ جلیلہ پر سرفراز تھا لیکن اُس نے اپنی ساری دولت گرجوں اور خانقاہوں کے لئے وقف کر رکھی تھی۔

یہ زمانہ سانگ خاندان کے زوال کا زمانہ تھا۔ ۸۴۵ء میں تھوڑے عرصہ کے لئے غیر ملکی مذاہب پر ایذارسانی رہی۔ ۲۶۰۵۰۰ بدھ بھکشو مردوں اور عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ۳۰۰۰ مسیحی اور زرتشت راہبوں کے ساتھ جا کر بدھ مت کا پرچار کریں چنانچہ بدھ مت جلدی بدھ مت ترقی کرنے لگا۔ ہمیں اس میں شک ہے کہ مسیحیت نے بھی بآسانی حیات تازہ حاصل کر لی ہو۔ اس کے بعد تباہی کا بازار گرم ہوا۔ ۸۷۸ء میں ملک میں بغاوت برپا تھی جس نے جنوبی چین کو تباہ و برباد کر دیا اور اس سے بحری تجارت کو ضرب کاری لگی۔ مغرب کی طرف پہنچانے والی خشکی کی راہیں اب مخدوش تھیں اور سلطنت کے زوال کی وجہ سے آمد و رفت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس طرح سے مسیحیوں کا اپنے وطن مالوف کے ساتھ رشتہ منقطع ہو گیا۔ دو سو سال

تک مسیحیت اقلیت ہی رہی۔ آٹھویں صدی کی ایک شہادت کے مطابق سُریانی زبان میں ۵۳۰ کتابیں موجود تھیں۔ ان میں سے پینتیس کتابوں کا ترجمہ چینی زبان میں کیا گیا۔ ان میں سے موسیٰ، الیشع، داؤد، پولُس اور صحیفوں کے الفاظ اور دعاؤں کی کتاب آسانی سے پہچانے جا سکتے تھے۔ ان کتابوں کا چینی زبان میں ایک ترجمہ ابھی تک موجود ہے۔ یہ ترجمہ بڑا قیمتی ہے۔ اس کا نام GLORIA IN EXCELSIODEO ہے۔ یہ ترجمہ منظوم ہے اور سُریانی نظم کے عین مطابق ہے۔ اس میں چینی زبان کی نادر تشبیہات اور استعارے ہیں۔ چینی عُلما انہیں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مسیحیت کو سُریانی خیال کیا جاتا تھا، اس لئے یہ مذہب غیر ملکی تصور کیا جاتا تھا، جو ایک غیر ملکی جماعت کا مذہب تھا۔ اگرچہ بشپ، پادری، راہب، مُحسن اور مترجمین ایران اور بلخ کے باشندے تھے تاہم بدھ مت بھی جو چین کے کثیر التعداد لوگوں کا مذہب ہے، ابتدائی دو سو سال تک غیر ملکی مشنریوں کی وجہ سے پھیلتا رہا۔ نیز ہم اس بات کا جائزہ لے چکے ہیں کہ ۸۴۵ء تک اس مذہب کو بھی غیر ملکی سمجھا جاتا تھا۔ بدھ مت مسیحیت سے ۵۰۰ سال قبل چین میں پہنچا اور چین کے زمانہ جاہلیت میں مذہب نے بڑا فروغ حاصل کیا اور سانگ خاندان کے احیاء کے زمانہ میں اس مذہب نے بڑی ترقی کی۔ اس خاندان کے خاتمہ پر بدھ مت ایذارسانی اور بدامنی کا مقابلہ کرنے کے قابل تھا۔ اس معاملہ میں

بُدھ مت اور مسیحیت میں جو فرق پایا جاتا ہے، وُہ قابلِ افسوس ہے۔ ۹۰۰ء کے بعد چین میں مسیحیت کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔

تاہم وُہ کارہائے نمایاں جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مٹ گئے اُن کے تاثرات ابھی تک پائے جاتے ہیں۔ مشرقی یورپ میں ۷۱۸ء تک اور مغربی یورپ میں ۷۳۲ء تک لوگوں کے دِلوں میں شک تھا کہ کیا اسلامی فتُوحات کے سامنے مسیحیت ٹھہر سکے گی؟ ۷۸۱ء میں چین کے مسیحی "ایک پتّھر کی تختی نصب کر رہے تھے جس پر مُنجّی خُداوند کی شریعت اور اُن مبشرانِ انجیل کی تعلیمات کندہ تھیں جو چینی حکمرانوں کے ہاں آتے رہتے تھے"۔ (یہ اس کتبے کے سُریانی حِصّہ کا اقتباس ہے) اور کسے علم تھا کہ کونسی چیز باقی رہے گی؟ ہم جو اس کا علم رکھتے ہیں جانتے ہیں کہ ۶۳۵ء میں سینٹ ایڈان [1] نارتھمبریا کی انگریزی سلطنت میں آیا۔ اس زمانہ میں مسیحی مذہب ایشیا سے دُور دیگر ممالک میں پھیل چُکا تھا۔ اب وُہ چینی تہذیب کے اس بڑے دارالحکُومت میں بھی پہنچا اور چین کی تاریخ کے اس دَورِ عظیم میں مسیحیت بھی اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔

---

[1] AIDAN.

چوتھا باب

پیش قدمی کا جاری رکھنا

(۹۵۰ء تا ۱۳۵۰ء)

اس زمانہ کے متعلّق چار باتیں کہی جا سکتی ہیں اور انہیں یاد رکھنے کی سہولت کی غرض سے ایک ایک صدی کے وقفوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ شمالی یورپ ۱۰۰۰ء کے قریب مسیحی ہو چُکا تھا۔

۲۔ ۱۱۰۰ء کے قریب اسلام کے چیلنج کا پہلا جواب دیا گیا۔ یہ جواب نہ ہی فیصلہ کُن تھا اور نہ ہی مکمل طور پر مسیحی تھا لیکن مغرب کی مسیحیت اب زمانۂ جاہلیت سے نکل چکی تھی اور اس امر کا احساس تھا کہ وُہ اسلامی خطرے کا سدِّ باب کر سکتی ہے۔

۳۔ ۱۲۰۰ء کے فوراً بعد راہبوں نے اس کا ایک بہترین طریقہ معلُوم کر لیا۔ یہ طریقہ صلیبی جنگوں سے بہتر تھا۔ تازہ مسیحی سرگرمی اور جوش وخروش کی اس تحریک کے اثرات شمالی افریقہ اور مشرق کی مشنوں میں نظر آنے لگے۔

۴۔ ۱۳۰۰ء سے پہلے کلیسیا کو موقع دیا گیا کہ وُہ ایشیا کے منگول

حکمرانوں کو مسیحیت کی طرف راغب کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ میں بشارتی خدمت کا یہ عظیم موقع تھا۔

۱۔ شمالی یورپ کو مسیحی بنانے کی تکمیل

ڈنمارک :- ڈنمارک میں سب سے پہلا مشنری انسکر[1] تھا۔ وہ ۸۲۶ء میں شمالی فرانس کی ایک خانقاہ سے آیا تھا۔ اُسے کولمبنس[2] اور اپنے کیتھلک راہبوں سے مشنری روایات ورثہ میں ملی تھیں۔ فرینکوں کے بادشاہ چارلے مین[3] کا بیٹا لوئیس پائس[4] تھا۔ اُس نے انسکر کو ہمبرگ کا آرچ بشپ مقرر کر دیا کیونکہ اُسے اُمید تھی کہ اُس کی قیادت میں تمام شمالی علاقے مشرف بہ مسیحیت ہو جائیں گے۔ اس کا یہ خیال بہت اعلیٰ تھا لیکن نویں صدی کے ہیبت ناک حقائق سے بالکل دُور تھا۔ ڈنمارک اور ناروے کے بُت پرست نارتھ مین[5] مسیحیت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ سمندروں کو عبور کر کے مسیحی ممالک کو تاخت و تاراج کرنے کے درپے تھے۔ جب ڈنمارک میں کینوٹ[6] بادشاہ حاکم تھا تو اُس وقت اس ملک میں مسیحیت قائم ہو چکی تھی۔ یہ بادشاہ ڈنمارک کے ایک بادشاہ کا بیٹا تھا۔ ۱۰۱۶ء میں کینوٹ انگلستان کا بھی بادشاہ بن گیا۔ ڈینز[7] اُس وقت تک انگلستان کا بہت سا حصہ فتح کر چکے تھے۔ وہ ایک مسیحی بادشاہ تھا اور اس نے مسیحیت کی اشاعت میں بڑی سرگرمی سے

---

[1] ANSKAR [2] CALUMBANUS [3] CHARLEMAGNE [4] LOUIS THE PIOUS [5] NORTHMEN [6] CNUT [7] DANES.

حصہ لیا جب دو سال کے بعد اس کا بھائی فوت ہوا تو اس کے لئے ڈنمارک کا تخت چھوڑ گیا۔ یہ بادشاہ انگلستان سے بہت سے مسیحیوں کو اپنے ساتھ ڈنمارک لے گیا تاکہ مسیحیت کی تبلیغ وہاں کرے تاکہ اُس مذہب کو فروغ حاصل ہو۔

ناروے :- انگلستان کے جنوب مغربی کونے میں سسلی کا جزیرہ ہے جہاں ایک مسیحی راہب رہتا تھا۔ اُس نے ایک بہت بڑے بحری قزاق اولف ٹرائیگوسن[1] پر ایسا اثر کیا کہ اُس نے اُس سے التجا کی کہ اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو بپتسمہ دیا جائے۔ اولف نے انگلستان کے ساحلوں پر تباہی مچا رکھی تھی لیکن اب وہ انگلستان واپس آیا اور مستحکم ہونے کے لئے ونچسٹر کے بشپ کے پاس پہنچا۔ ۹۹۵ء میں وہ مسیحی ہو کر واپس لوٹا اور ناروے کے تاج و تخت کا مطالبہ کیا۔ ابھی تک وہ ایک متشدد اور جابر آدمی تھا۔ پہلے تو وہ دُور ممالک میں مسیحی عبادت خانوں کو جلا دیا کرتا تھا لیکن اب اُس نے ناروے کے تمام بُت خانوں کو مسمار کرنا شروع کر دیا۔ وہ بُت خانوں کے پجاریوں کو قائل نہ کر سکا لہٰذا اس پر اُس نے بُت پرستوں کے ساتھ جنگ چھیڑ دی۔ ۱۰۰۰ء کے قریب سرسری طور پر ناروے میں مسیحیت کی اشاعت کی تکمیل ہو چکی تھی۔ ناروے کے ساتھ ساتھ اس کے مقبوضہ آئس لینڈ[2] اور گرین لینڈ[3] نے بھی مسیحیت کو قبول کر لیا۔

سویڈن :- بادشاہ اولف انگلستان سے بشپوں اور مشنریوں کو بارہ

---

[1] OL' TRYGVASON [2] ICELAND [3] GREENLAND.

میں لایا۔ ان میں سے ایک سگفرڈ[1] تھا جو بادشاہ اولف کی وفات کے بعد ۱۰۰۰ء میں سویڈن پہنچا۔ سویڈن کا بادشاہ بھی مسیحی ہو چکا تھا۔ انگلستان کے بہت سے لوگوں نے اس خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ بہت سے خادمانِ دین نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ مسیحیت کو سویڈن میں پھیلنے میں بہت عرصہ لگا۔ ۱۱۰۰ء کے قریب مسیحیت سویڈن میں کامیاب و کامران ہوئی۔

روس: ۔ ولیڈیمیر[2] آرچ ڈیوک آف کیو ۹۸۸ء میں تبدیل ہوا۔ تبدیل ہونے کا لفظ صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس کی ذاتی اور سماجی زندگی میں قطعاً کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی آٹھ سو خواصیں تھیں۔ اس کی رگوں میں نارتھ مین کا خون تھا۔ اس نے تمام عمر قتل و غارت کا بازار گرم رکھا لیکن وہ چیز جس نے اس پر اثر ڈالا یہ تھی کہ اس کے جنوب اور مغرب میں ایسی ہمسایہ حکومتیں تھیں جہاں ایک اعلیٰ تہذیب نشوونما پا رہی تھی جس کا مرکز مسیحی مذہب تھا۔ اگر اس بادشاہ کی تبدیلی برائے نام تھی تو بھی روس میں مسیحیت کے لئے راستہ صاف ہو گیا تھا۔ شمال کی دوسری قوموں کے برعکس روس میں مسیحیت یونانی شکل میں پہنچی۔ منگولوں نے ۱۲۳۶ء میں روس پر حملہ کیا۔ اس کے بعد مسیحیت روس میں بڑی مضبوطی سے قائم ہو گئی اور روس کی ثقافت اور تہذیب کا حصہ بن گئی۔ یہی ثقافت روسیوں اور منگولوں میں امتیاز کا باعث تھی۔

---

[1] SIGFRID. [2] VLADIMIR

۲۔ اسلام کے چیلنج کا جواب: ۔ سلجوقی ترک وسطی ایشیا کے پہاڑی علاقوں سے مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے مذہب اسلام کو قبول کر لیا تھا۔ ۱۰۵۵ء تک اُن کے سردار کو بغداد کا سلطان تسلیم کر لیا گیا تھا۔ خلیفہ ایک مذہبی لیڈر تو تھا لیکن وہ سلطنت کا سربراہ نہیں تھا۔ اس کے بعد سلجوقیوں نے شام اور فلسطین کے ممالک پر قبضہ جما لیا اور ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ پھر ۱۰۷۱ء میں وہ آرمینیا میں پہنچے اور بازنطینی فوجوں سے اُن کا مقابلہ ہوا۔ انہوں نے اس فوج کو شکست فاش دی اور شہنشاہ کو گرفتار کر لیا۔ ایشیائے کوچک اِن کی یلغار کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ قسطنطنیہ جو یونانی مسیحیت کا دارالحکومت تھا، ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسلام کی اِس فتح کرنے والی پیش قدمی کو کونسی چیز روک سکتی تھی؟ تاہم مغرب میں اُمید کی کرن جگمگا رہی تھی۔ نارمن فرنچ[1] (وہ نارتھ مین جو شمالی فرانس میں آباد ہو چکے تھے) عین اسی وقت مسلمان حملہ آوروں کو سسلی سے نکال رہے تھے اور شمالی ہسپانیہ کی مسیحی ریاستیں اسلامی غلبہ و اقتدار کو کمزور کر رہی تھیں۔ ۱۰۹۵ء میں پوپ اربن دوم نے صلیبی جنگوں کا آغاز کیا۔ اس نے اپنے مقصد کو زیادہ وسیع کر دیا۔ اس کا مقصد محض سلجوقیوں سے قسطنطنیہ کی حفاظت ہی کرنا نہ تھا بلکہ وہ غیر مسیحیوں کو ارضِ مقدس سے نکالنا چاہتا تھا۔ اس نے دھڑا دھڑ ... وعدہ کیا کہ

---

[1] NORMAN FRENCH.

اپنے بھائیوں کو قتل کرنے سے گریز کرو۔ ایمان کے سپاہی ہوتے ہوئے غیر ملکی اقوام کے خلاف جہاد کرو۔ تم ناقابلِ تسخیر مسیحی لشکر ہو جو قدیم زمانہ کے اسرائیلی لشکر سے بدرجہا بہتر ہے۔ خداوند یسوع مسیح تمہارا قائد ہے، اُس کی قیادت میں اپنے یروشلیم کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو جاؤ۔ ترکوں پر حملہ کرو اور انہیں اس سرزمین سے نکال دو۔ ترک تو جیبوسائٹس[2] سے بدتر ہیں۔"

اس ہجوم نے جس سے پوپ اربن[1] خطاب فرما رہے تھے بآواز بلند کہا:۔ "یہ خدا کی مرضی ہے۔" فرانس اور جرمنی کے بہت سے حلقوں میں بااثر مبشروں نے لوگوں کے جوش و خروش کو اُبھارا۔ لوگوں نے اپنے کھیتوں تک کو بیچ دیا اور اپنے مال اسباب اور بال بچوں کو چھکڑوں میں لاد کر ان لوگوں میں شامل ہو گئے جو بے ترتیبی سے مشرق کی طرف بڑھ رہے تھے، لوگوں کو "صلیبی جنگ" سے موت اور غلامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ یہ صلیبی جنگ کی پہلی تحریک تھی جو عوام کے خیالات کو اپنی طرف مبذول کرنے کی غرض سے جاری کی گئی تھی۔ اس وقت مغرب دورِ جہالت سے نکل کر وسیع دُنیا میں سانس لے رہا تھا۔ صلیبی جنگوں کا یہ جذبہ جس میں بہادری کے کارنامے دکھانے کی خواہش اور مالِ غنیمت حاصل کرنے کی اُمید تھی، اگلے دو سو سال تک لوگوں میں پیدا کیا جانے والا تھا۔

---

[1] POPE URBAN. [2] JEBUSITES.
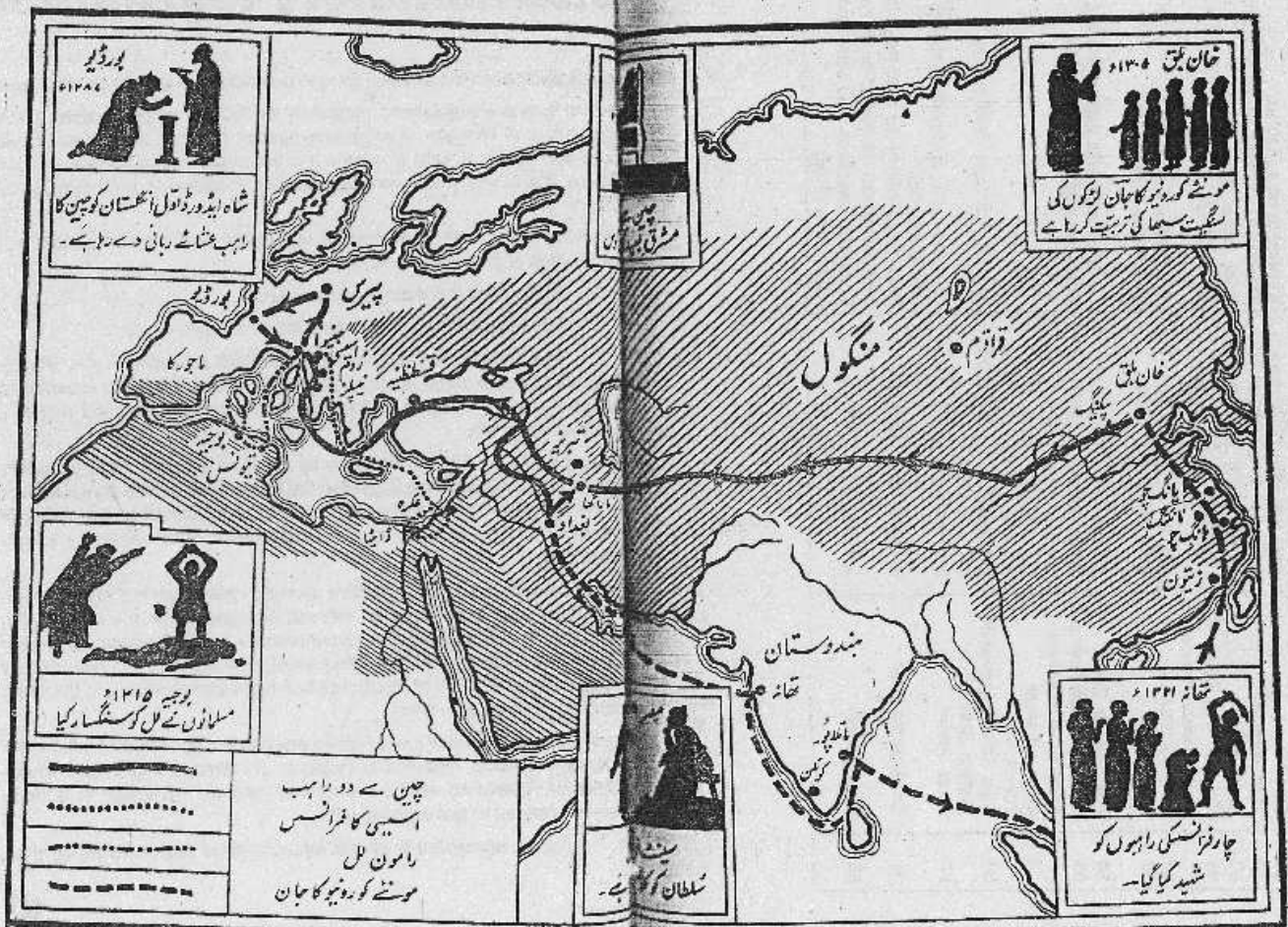
صحیح معنوں میں صلیبی جنگ ۱۰۹۶ء میں شروع ہوئی۔ فوجوں کی زیادہ تر تعداد فرانسیسیوں پر مشتمل تھی یعنی اُن میں خاص طور پر نارمن فرنچ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام مغربی ایشیا اور ہندوستان تک آج تک یورپین کے لئے جو "فرنگی" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے وُہ دراصل "فرینک" ہے۔ صلیبی جنگیں لڑنے والوں نے بازنطینی شہنشاہ کے لیے ایشیائے کوچک کا بہت سا علاقہ فتح کر لیا۔ ۱۰۹۹ء میں یروشلم کو بھی فتح کر لیا گیا۔ شام اور فلسطین میں انہوں نے کچھ لاطینی ریاستیں بنا دیں جو ایڈیسہ، انطاکیہ، ٹریپولی اور یروشلم کے اردگرد پھیلی ہوئی تھیں۔ ان پر مغربی لوگ حکمران تھے اور یورپین سپاہی ہی قلعوں کی حفاظت پر مامور تھے لیکن اس کا اہتمام کیسے کیا جائے جو پچاس سال تک انہیں بڑھتی ہوئی اسلامی قوتوں کی طرف سے بے حد خطرہ رہا اور وُہ کمک کے طالب رہے۔ پس زیادہ صلیبی جنگوں کا انتظام کیا گیا۔ سب سے زیادہ اہم تیسری صلیبی جنگ تھی جو ۱۱۹۰ء میں لڑی گئی۔ اس جنگ میں شاہانِ جرمنی، فرانس اور انگلستان نے بہ نفسِ نفیس شمولیت کی۔ سب سے زیادہ المناک چوتھی صلیبی جنگ تھی جو ۱۲۰۴ء میں لڑی گئی۔ مغرب کی فوجوں کو قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کا حکم ہوا یعنی لاطینی مسیحی یونانی مسیحیوں کے خلاف صف آرا ہوئے۔ اُن دونوں نے اسلام کے خلاف مشترکہ محاذ قائم کرنے کی بجائے ایک

دُوسرے کو نیچا دکھانے کا ارادہ کر لیا۔ قتل و غارت کے اِس کارنامے نے مشرقی رُومی سلطنت کو کمزور کر دیا اور یہی چیز اِس کے زوال کا باعث بنی۔ تواریخ عالم میں مسیحیوں میں اختلاف پیدا ہونے کا یہ بڑا ہی شرمناک واقعہ ہے۔ اسی تیرھویں صدی کے اختتام سے پیشتر یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت تھی کہ صلیبی جنگوں کے تحت لشکر کشی کے تمام منصوبے ناکام ثابت ہوئے ہیں اور رفتہ رفتہ صلیبی جنگوں کا یہ جوش و خروش بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کا مستقل طور پر یہ فائدہ ہوا کہ محدود مغرب یُونانیوں کی ترقی پذیر اور اعلیٰ تہذیب اور مشرق کے مسلمانوں کے تہذیبی ورثے سے رُوشناس ہوا۔ مغرب کی یورپین اقوام اب وسیع تر دُنیا سے دُور رہنا نہیں چاہتی تھیں۔ اُن میں سے بعض نے یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی کہ دُنیا کتنی وسیع ہے اور اب وُہ مشرقی بحیرۂ رُوم سے ہی مطمئن نہ تھے بلکہ وُہ چین کے سمندروں میں بھی جانے لگے۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ بعض لوگ اس وسیع دُنیا میں خُداوند مسیح کی بہتر طریق سے خوشخبری سُنانے لگے۔

۲۔ راہبوں نے ایک نہایت ہی اچھا طریقہ معلوم کر لیا۔ فرانسس شمالی اٹلی کے ایک تاجر کا بیٹا تھا۔ ۱۲۰۵ء میں اس نے خادم الدین کو انجیل مُقدس میں سے متی ۱۰ باب کا یہ حوالہ پڑھتے سُنا جب خُداوند نے بارہ شاگردوں کو مُنادی کے لئے بھیجا۔

اس باب کی سات سے دس آیات اُس کے دِل میں اُتر گئیں۔ اگلے روز وُہ خُود مُنادی کے لئے نکلا۔ اُس نے اپنے ہمراہ نہ کوئی پیسہ لیا نہ جھولی، نہ کپڑے، نہ جُوتے اور نہ لاٹھی۔ اُس نے خُدا کے کلام کی مُنادی شروع کر دی، جس سے راہبوں کے ایک حلقہ کی ابتدا ہُوئی۔ اس حلقہ کے شرکا فرانسسکنز کہلائے۔ اس راہبی حلقے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ رسُولوں کے طرزِ مُنادی اور اُن کی غریبانہ زندگی کی ترویج متی رسُول کی انجیل کے مطابق کی جائے۔ ہمارا فرض ہے کہ مُنادی کو تمام دیگر باتوں پر ترجیح دیں۔ اس حوالہ میں "چلتے چلتے مُنادی" کرنے کا ذکر ہے۔ فرانسس کی تعلیم اور اُس کے کاموں کی تفہیم صرف اسی صُورت میں سمجھ میں آ سکتی ہے جب ہم اُس زمانہ کے نوجوانوں کے رومانی انداز کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اُس زمانہ میں اُمرا اپنی محبُوباؤں کے ناز و ادا پر نقدِ دِل نثار کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وُہ کمزوروں کو بچانے کے لیے شمشیر آبدار کے جوہر دکھایا کرتے تھے۔ اُنہیں اُمید تھی کہ وُہ کسی دن صلیبی جنگوں میں شامل ہو کر "مسیحی مُجاہد" کہلائیں گے۔ فرانسس نے اپنی محبُوبہ سے محبت کا ذکر کیا ہے لیکن اُس کی محبُوبہ "غربت" ہے۔ فرانسس نے کبھی شمشیر استعمال نہیں کی تھی لیکن اُس نے اپنے ہاتھوں سے گداگروں اور کوڑھیوں کی بھی خدمت کی۔ ۱۲۱۹ء میں وُہ اپنی جان پر کھیل کر مصر پہنچا اور سلطان مصر کے سامنے

منادی کی۔ اُس نے کوشش کی کہ مسلمانوں کو قتل کرنے کی بجائے اُنہیں مسیحی بنا کر ارضِ مقدس کو فتح کرے۔ مراکو میں پانچ فرانسسکن کو شہید کر دیا گیا کیونکہ اُنہوں نے اس جگہ بھی مہم شروع کر رکھی تھی۔ فرانسس نے اُن کے متعلق کہا "اب میرے پانچ حقیقی بھائی ہیں"۔ ۱۲۲۱ء میں اُس نے اپنے راہبانہ حلقہ میں یہ بھی اضافہ کیا:-

"بھائیوں میں سے جسے خدا ہدایت کرے کہ وہ مسلمانوں اور دوسرے غیر مسیحیوں میں جا کر انجیل کی منادی کرے اُسے جانے دیا جائے..... بھائیوں کو، جہاں کہیں وہ ہیں، یاد رکھنا چاہیئے کیونکہ اُنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے بدن کو ہمارے خداوند یسوع مسیح کو دے دیا ہے اور اُسی کی محبت کی خاطر اُنہیں اپنے دیدہ و نادیدہ دشمنوں کی سختیاں برداشت کرنی چاہئیں"۔

اسی سال راہبوں کے ڈومینیکن[1] حلقہ کا بولونا[2] میں اجلاس منعقد ہوا۔ اس حلقہ نے خداوند مسیح کے اس حکم کو اپنایا "ساری دنیا میں جا کر ساری خلق کے سامنے انجیل کی منادی کرو"۔

تیرھویں صدی میں اہلِ اسلام میں انجیل کی منادی کرنے والا سب سے بڑا مشنری رامون لل[3] تھا۔ اُس کا تعلق راہبوں کے فرانسسکی اور ڈومنکی سلسلوں سے تھا۔ وہ ہسپانیہ کا باشندہ تھا اور ماجورکا[4] میں پیدا ہوا تھا۔ مقام اراگان کے بادشاہ نے

[1] DOMINICAN [2] BOLOGNA [3] ROMON LULL
[4] MAJORCA.

رامون لل کے باپ کے زمانہ میں مسلمانوں کو شکست دے کر فتح کیا تھا۔ وہ بادشاہ کے درباریوں میں شامل تھا لیکن گوشۂ تنہائی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کے بعد ۱۲۶۳ء میں اُس کی زندگی تبدیل ہو گئی اور اُس نے روحانی جنگ کی طرف توجہ مبذول کی لیکن فرانسس کے برعکس اُسے معلوم تھا کہ کسی کامیاب مشن کے لئے تربیت کی ضرورت ہے۔ وہ زبانِ عربی کا ایک مشہور عالم تھا۔ اُس نے ماجورکا میں مشنریوں کے لئے ایک کالج کی بنیاد رکھی۔ اس مقصد کی تکمیل کی خاطر اُس نے بہت سے مضامین لکھے۔ وعظ اور لیکچر بھی کئے۔ وہ پیرس اور مانٹپلئیر[1] پہنچا۔ یہ مقامات علوم و فنون کے مراکز تھے۔ پیرس تو ایک صدی سے یونیورسٹی چلی آتی تھی اور مانٹپلئیر اس وقت یونیورسٹی کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ مسیحی کلیسیا کا اوّلین فرض ہے کہ وہ غیر مسیحی دنیا میں انجیل کی منادی کا انتظام کرے اور اپنے قابل ترین علما کو اس کام کی طرف راغب کرے اور اپنے مال کا بہت زیادہ حصہ اس کام کے لئے وقف کرے۔ اُس نے نہ صرف شمالی افریقہ کی طرف بلکہ مشرق کی طرف بھی مشن بھیجنے کی مہم شروع کی۔ وہ نہ صرف اہلِ اسلام میں تبلیغ کا حامی تھا بلکہ وہ منگولوں میں بھی انجیل کی منادی کرنے کا خواہاں تھا۔ وہ مسلمانوں کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اُس نے اُن کے متعلق کہا ہے کہ "اگر ایک دفعہ مسلمانوں نے مسیحیت قبول کر لی تو پھر دوسری دنیا

[1] MONTPELLIER.

کو مسیحی بنانا آسان ہوگا"۔ اُس نے خود تین مشنری دورے کئے۔ ۱۲۹۲ء میں اُس نے تیونس کا دورہ کیا۔ یہ اُس کا پہلا دورہ تھا۔ ۱۳۰۷ء میں اُس نے الجیریا کا دورہ کیا۔ ۱۳۱۴ء میں اُس نے ان دونوں مقامات کا دورہ کیا۔ یہ اُس کا تیسرا دورہ تھا۔ بعض مُسلم رہنماؤں کے ساتھ اُس کے بڑے دوستانہ مراسم تھے۔ اُس نے کئی بار شوخ مسلمانوں کو بپتسمہ بھی دیا۔ ۱۳۱۴ء میں الجیریا میں بوجیہ[1] کے مقام پر ایک ہجوم نے اُسے سنگسار کر دیا۔

لل کا یہ خیال کہ کلیسیا کو مسلمانوں میں تبلیغ کا بیڑا اُٹھانا چاہیئے ناقابلِ عمل ثابت ہوا اور فرانسسکی اور ڈومینکی راہبانہ حلقوں کے چند مبشروں نے اہلِ اسلام میں منادی کی مہم جاری رکھی۔ ان دونوں حلقوں کے راہب شمالی افریقہ میں پھیلے ہوئے تھے جب کبھی انہیں موقع میسر آتا تو وہ فلسطین اور شام میں بھی منادی کیا کرتے تھے۔ اُن میں سے بعض منگولوں کے مُلک میں بھی پہنچے۔

۴۔ ایشیا کے منگول حکمرانوں میں مسیحیت کی تبلیغ کے مواقع

ہم نے اس امر کا جائزہ لیا کہ ۹۰۰ء میں مسیحیت چین سے رخصت ہو چکی تھی۔ ۱۰۰۹ء میں مرو[2] کے بشپ نے مشرق کے کیتھولی کوس کو شمالی منگولیا کے کریت[3] قبیلے کے بادشاہ کے قبولِ مسیحیت کے

[1] BUGIA [2] MERV [3] KARRITS.

متعلق تحریر کیا۔ یہ جگہ دو ہزار ۲۰۰۰ میل شمال مشرق میں تھی۔ وہ ایک برف کے طوفان میں گھر گیا۔ اُس نے رویا میں ایک سینٹ کو دیکھا جس نے اُسے کہا کہ "اگر وہ مسیح کے گلے کی بھیڑ بن جائے تو وہ بخیر و عافیت واپس پہنچ جائے گا"۔ چنانچہ وہ صحیح و سالم اپنے گھر پہنچ گیا۔ اُس نے اُن مسیحی سوداگروں کو اپنے پاس بلایا جو وہاں رہتے تھے اور اُن سے مسیحی ایمان کے متعلق بات چیت کی۔ اُس نے اُن سے انجیل مقدس بھی لی اور ہر روز اُس کا مطالعہ کرنے لگا یہاں تک کہ اُس نے مسیح خداوند کو اپنا نجات دہندہ قبول کر لیا اور قاصد کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ کسی خادم الدین کو بھیجا جائے بالآخر یہ سارا قبیلہ اور اُن کا بادشاہ مسیحی ہو گئے۔ ۱۱۴۴ء کے قریب جب اسلامی طاقتوں نے پہلی صلیبی جنگ کی فتوحات کو شکست میں تبدیل کرنا شروع کیا تو مغرب کے لوگوں نے مشرق کے ایک طاقتور مسیحی بادشاہ کے متعلق تحریر و تقریر کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ اس بادشاہ کو پریسٹر جان (پریسیٹ جان) کہتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ وہ مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کرے گا اور مسیحی سلطنت کو ازسرِ نو بحال کرے گا۔ ۱۱۴۵ء تا ۱۳۰۰ء تک اس قسم کی اُمیدیں کی جاتی رہیں اور پندرھویں اور سولھویں صدی میں ان اُمیدوں کا پھر اعادہ کیا جانے لگا۔ یہ تحریریں زیادہ تر من گھڑت افسانے یا جعلی کہانیاں تھیں حقیقت یہ تھی کہ کریت میں مشرق کی کلیسیا موجود تھی اور وہ دیگر قبائل بھی

تھے جنہوں نے مسیحی مذہب قبول کر رکھا تھا۔ کریت کے مشرق میں منگول تھے جو ابھی تک مسیحیت کے اثر سے نابلد تھے۔ سنہ ۱۲۰۰ء کے قریب اُنہوں نے مغرب کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ سنہ ۱۲۴۰ء تک وُہ فاتحین کی حیثیت سے ایشیا سے آگے بڑھے اور یورپ میں داخل ہوگئے۔ اُنہوں نے پولینڈ، بوہیمیا اور آسٹریا کے راستے بحیرہ ایڈریاٹک کے ساحلوں تک یلغار کی۔ منگولوں کے حملوں کی یورپ تاب نہ لاسکا۔ ڈیڑھ سَو سال پیشتر سلجوق ترکوں کے حملوں سے یورپ لرز اُٹھا تھا۔ منگولوں نے صرف روس اور دریائے ڈینیوب تک کے علاقوں کو اپنے قبضے میں رکھنے پر اکتفا کیا۔ دریائے ڈینیوب اُن کی سلطنت کی مغربی حد تھی۔ یہ سلطنت ایک سو سال تک کوہ ہمالیہ کے شمال میں ایشیا تک پھیلی رہی۔ پوپوں اور بادشاہوں کے دل میں منگولوں کا خوف تھا۔ اُنہیں یہ اُمید تھی کہ شاید اُن میں پریسٹ جان بھی مل جائے گا، اس لئے اُنہوں نے جو اپنے سفیر بھیجے وُہ عام طور پر راہب تھے۔ ان سفیروں میں سے سب سے زیادہ مشہور روبرک[۱] کا ولیم تھا جو فرانسسکی راہبانہ حلقہ کا ولندیزی تھا۔ سنہ ۵۵-۱۲۵۲ء میں وُہ منگولوں کے دار السلطنت قراقرم میں پہنچا۔ اُس کی کتابوں سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ وہاں مسیحی موجود تھے۔ بعض بعض مقامات پر پورے پورے قبیلے مسیحی تھے اور وُہ وسطی ایشیا میں پھیلے ہُوئے تھے۔ بہت جلد منگولوں میں سے مسیحی اعلیٰ عہدوں پر سرفراز ہو گئے۔ چنگیز جو خان اعظم

[۱] RUBURK.

(شہنشاہ) اوّل تھا (سنہ ۲۷-۱۲۰۶ء) اُس نے اپنے ایک چھوٹے بیٹے کی شادی کریت شہزادی سے کی۔ چینی زبان کی کتابوں میں درج ہے کہ یہ شہزادی "صلیبی خانقاہ" میں دفن کی گئی۔ سُریانی زبان کی کتابوں کے مطابق "وُہ کانسٹنٹائن کی ماں ہیلن کی طرح مسیحی ایماندار تھی"۔ اُن کے تین بیٹے تھے جن کے نام منگو، ہلاکو اور قبلائی تھے۔ منگو سنہ ۱۲۵۱ء میں خانِ اعظم بنا۔ دُوسرے (ہلاکو) نے ایران کی سلطنت کی بُنیاد ڈالی اور اپنے باپ کی طرح اُس نے بھی ایک مسیحی خاتُون سے شادی کی۔ تیسرا ۹۴-۱۲۵۹ء میں خانِ اعظم بنا۔ قبلائی خان نے خانہ بدوش زندگی کو ترک کر دیا اور قراقرم کو چھوڑ دیا جو خیموں کا شہر ہے اُس نے بیکن کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ اُس کا نام خان بلیغ رکھا یعنی خان کا شہر۔ قبلائی خان نے مسیحیت کو پھلنے پھُولنے کا موقع دیا۔

سفیروں کے علاوہ مغرب سے تاجر بھی آیا کرتے تھے۔ اُس نے وینس کے دو باشندوں کو جن کے نام نکولو[۱] اور ماٹیو پولو[۲] تھے سنہ ۱۲۶۹ء میں چین سے پوپ کے پاس ذیل کا پیغام دے کر روانہ کیا۔

"آپ جانتے ہیں کہ اِن علاقوں کے مسیحی (مشرقی کلیسیا) بالکل جاہل ہیں اور وُہ کچھ نہیں کرتے اور نہ اُن کے پاس کوئی طاقت ہے۔ آپ اپنے خادم الدین اعظم کے پاس جائیں اور اُن سے میری طرف سے درخواست کریں کہ وُہ ایک سو مُبشروں کو بھیجیں جنہیں مذہبی علم

[۱] NICOLO [۲] MATTEOPOLO.

پر عبور حاصل ہو۔ میں خود بھی بپتسمہ لوں گا۔ اس کے بعد میرے
اُمرا اور وُزراء اور رعایا کے لوگ مسیحیت قبول کر لیں گے اور اس
طرح سے آپ کے علاقہ کی نسبت اس جگہ مسیحیوں کی تعداد زیادہ
ہو جائے گی۔"

۱۲۷۱ء میں یہ دونوں پولو بھائی مشرق کی طرف اپنے دوسرے
سفر پر روانہ ہُوئے۔ پوپ نے سب سے بڑی یہ بات کی کہ اُن کے ساتھ
ڈومنکی حلقہ کے دو راہبوں کو بھیج دیا۔ نوجوان مارکو جو اس وقت سترہ
برس کا لڑکا تھا وُہ بھی سیاحت کی غرض سے اُن کے ساتھ جانے
کے لئے اصرار کرنے لگا۔ بیس برس کے بعد وُہ اپنے وطن وینس
میں واپس آیا۔ وُہ زیادہ عرصہ قبلائی خان کے معتمد کی حیثیت سے
اُس کے دربار میں رہا۔ اَے کاش! خُدا کی محبت کی خاطر اُس
کے پاس ایک سو مبشر پہنچ سکتے۔ مذکورہ ڈومنکی حلقہ کے راہبوں
کے بارے میں مارکو پولو لکھتا ہے کہ وُہ آرمینیا تک پہنچے۔ اس کے
بعد انہیں سفر کی صعوبتوں کا احساس ہُوا۔ وُہ آگے سفر کرنے سے ڈرتے
تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ وُہ آگے نہیں بڑھیں گے۔"

۱۲۸۹ء میں پوپ سے ایک اور درخواست کی گئی کہ قبلائی خان
کے پاس مشنری بھیجے جائیں۔ یہ درخواست قبلائی کے پوتے ارغون
نے بھیجی تھی جو ایران کا حاکم تھا۔ وُہ بھی منگول تھا اور اُس کی ملکہ مسیحی
تھی۔ جان آف مانٹیکارونیو[1] جو فرانسسکی حلقے کا راہب تھا یہ پیغام

---

[1] JOHN OF MONTOCORVINO.

لے کر پوپ کے پاس آیا۔ پوپ نے جان اور ڈومنکی حلقہ کے ایک راہب
نکولس کو اس خدمت کے لئے روانہ کیا چنانچہ انہوں نے خلیج فارس
تک خشکی کا سفر کیا اور پھر وُہ سمندر کے راستے تھانہ میں آئے جو بمبئی کے
قریب ہے اور پھر مائلاپور میں تُومارسُول کا مزار دیکھنے کے لئے گئے
جس کے متعلق جان رقمطراز ہے:-

"میں تیرہ مہینے ہندوستان میں تُومارسُول کے گرجے میں رہا۔ میں
نے سو آدمیوں کو بپتسمہ دیا۔ نکولس میرے ساتھ تھا وُہ فوت ہو گیا اور
اسی گرجا میں دفن ہُوا اور میں چین چلا گیا۔"

زمانۂ قدیم کے سیاح اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ مشرق
میں مسیحی کلیسیا موجود تھی۔ جنوبی ہندوستان میں بھی ایک کلیسیا تھی
بلکہ وہ مقام جسے بمبئی کہا جاتا ہے، وہاں بھی ایک کلیسیا تھی چنانچہ
جان اکیلا ہی چین پہنچا۔ اس مقام کو عرب جہازران زیتون
کہتے تھے۔ وہ پھر ۱۲۹۳ء میں خان باقی پہنچا۔ قبلائی خان نے اسی
سال وفات پائی تھی۔ جان اکیلا تھا۔ اُس نے گانے والے لڑکوں کی
ایک جماعت تیار کی اور اُن کو لاطینی زبان میں عبادت کرنا سکھایا،
اُس نے یورپین سوداگروں کی امداد سے دو گرجے تعمیر کئے جس
کا یہ ایمان تھا کہ مسیحی عبادت ہی بہترین شہادت ہے وُہ لکھتا ہے:-

"جب وُہ ہمیں گرجے میں دیکھتے ہیں کہ ہم بڑے ادب سے اپنی عبادت
کرتے ہُوئے گاتے ہیں تو وُہ بہت حیران ہوتے ہیں۔ جب ہم گاتے ہیں

تو شہنشاہ سلامت اپنے کمرے میں ہماری آواز سن سکتے ہیں۔ ان بُت پرستوں میں ہماری آواز دُور دُور تک پہنچ رہی ہے۔ خدا کے فضل سے اس کا بہت ہی اچھا اثر ہوگا۔"

وُہ بیان کرتا ہے کہ نئے عہد نامہ اور زبور کو منگولی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے اور ناخواندہ لوگوں کے لئے بائبل کی تصاویر بنائی گئی ہیں۔ اس کے بعد وُہ آرچ بشپ کے عہدے پر فائز کیا گیا اور ۱۳۲۸ء میں خدا کی خدمت کرتے ہُوئے اُس نے وفات پائی۔ جب پوپ کو اس بات کی خبر ملی کہ چین میں مسیحیت کی تبلیغ کا آغاز ہو چکا ہے تو اُس نے ۱۳۰۷ء میں فرانسسکی حلقہ کے سات راہبوں کو بشپ کے عہدہ کے لئے مخصوص کیا، اور انہیں کمک کے طور پر چین کی طرف روانہ کیا، لیکن اُن میں سے صرف تین بشپ سفر کی صعوبتوں کا مقابلہ کر کے زندہ رہے۔ چار اور فرانسسکی حلقہ کے راہبوں کو بھیجا گیا لیکن ۱۳۲۱ء میں تھانہ (بمبئی کے قریب) کے مقام پر انہیں مسلمانوں نے قتل کر دیا۔ ہندوستان کی سرزمین کے یہ پہلے مسیحی شہید تھے۔ زیتون اور چند دیگر شہروں کے متعلق ہم پڑھتے ہیں کہ وہاں مسیحی مراکز تھے۔ وُہ مسیحی جو چین میں تھے اور سرکاری اہلکار، سپاہی اور سوداگر تھے وُہ چینی نہیں تھے بلکہ شمال اور مغرب کے اُن قبائل سے تعلق رکھتے تھے جو ہجرت کر کے وہاں آئے تھے۔ جب ۱۳۶۸ء میں منگول خاندان کا زوال ہُوا تو یہ غیر ملکی بھی چین کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے اور اُن کے ہمراہ مسیحیت بھی چین سے رخصت ہو گئی۔ جس

پاس موونٹ[1] کی قبلائی خاں نے پیش گوئی کی تھی اُس کے لئے وہاں مشن بڑی دیر کے بعد پہنچی۔ یہ تحریک بڑی مختصر اور محدود تھی۔ زیتون سے ایک خط ملا جو اس طرح لکھا گیا تھا۔

"اگر ہمیں اُن کی زبان میں دستگاہ ہو تو خدا کے عجیب و غریب کام ظاہر ہو سکتے ہیں۔ فصل تو بہت ہے لیکن کاٹنے والے بہت تھوڑے ہیں اور درانتی بھی نہیں ہے۔ ہماری تعداد بہت ہی قلیل ہے۔ ہم بہت عمر رسیدہ ہیں اور زبانیں سیکھنے کے قابل نہیں۔"

پھر ایک المناک بات یہ ہے کہ مسیحیوں میں تفرقے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فرانسسکی مشن اور مشرقی کلیسیا میں رقابت ہے۔

قبلائی خاں نے کہا ہے "اِن علاقوں میں مسیحی کچھ نہیں کرتے"۔ لیکن شہر خان باقی کے دو راہبوں نے بہت کچھ کیا۔ ساماتا اور مرقس چین کے دو راہب تھے وُہ انگوت یا اونگا نسل سے تھے انہوں نے ارضِ مقدس کی زیارت کا فیصلہ کیا۔ بڑی مصیبتیں اُٹھانے کے بعد وُہ بغداد میں پہنچے لیکن سلجوقی ترکوں نے انہیں ارضِ مقدس میں جانے کی اجازت نہ دی۔ کیتھولی کوس نے مرقس کو بشپ مخصوص کیا اور اُسے چین کا میٹرو پالیٹن بنا کر واپس بھیجا۔ جنگ و جدل کا زمانہ تھا اور ان کا ساتھ بڑا خطرناک تھا، اس لئے یہ دونوں واپس بغداد آ گئے۔ کیتھولی کوس وفات پا چکا تھا چنانچہ بشپوں کو بلایا گیا تھا کہ وُہ اُس کے جانشین کا انتخاب کریں چونکہ مرقس خود بھی بشپ تھا اس لئے وُہ بھی اس انتخاب میں شامل ہُوا اور

---

[1] SAMNA.

وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تمام بشپوں نے اُسے کیتھولی کوس کا جانشین
منتخب کر لیا ہے۔ پس ۱۲۸۷ء میں بیکن کا ایک راہب مشرق کی تمام
کلیسیا پر حکمران تھا۔ یہ کلیسیا شام سے مجر چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی
تک سامر کا سفر ختم نہیں ہوا تھا۔ ایران کا حکمران ارغون مسیحیت سے
اُنس رکھتا تھا۔ وہ مغرب کے مسیحیوں کے ساتھ مل کر ترکوں کے خلاف
ایک نئی صلیبی جنگ کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ اگر اس معاملہ میں مغرب
نے ارغون کی حمایت کی ہوتی تو پریسٹر جان کی اُمید پوری ہو جاتی۔ ارغون
نے ایک مسیحی راہب سامہ کو مغربی ممالک کے بادشاہوں کے دربار میں
میں سفیر بنا کر بھیجا۔ سامہ راہب قسطنطنیہ، رُوم، پیرس اور بورڈیو
پہنچا۔ وہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ جب اُس نے رُوما کے
کارڈینلز کو بتایا کہ "بہت سے منگول مسیحی ہیں، یہاں تک کہ شہزادے
اور شہزادیاں اور بیگمات بھی مسیحی ہیں مگر یورپ کی طرف سے ہمارے
پاس کوئی مشرقی ممالک کا مبشر نہیں پہنچا۔ مُقدس رسولوں نے ہمیں
تعلیم دی اور ہم ابھی تک اُن کی تعلیم پر عمل کرتے ہیں" اس پر وہ
بہت ہی حیران ہوئے۔

سامر اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ فرانس کے بادشاہ نے
اُس کی ضیافت کی۔ اُسے اس بات سے بڑی حیرانی ہوئی کہ پیرس
کی یونیورسٹی میں ہزارہا طلبا کتابِ مُقدس اور سائنس کی تشریح و
تفسیر میں مشغول ہیں۔ اُس نے بادشاہِ انگلستان سے بھی ملاقات

کی۔ بادشاہ ایڈورڈ اوّل نے سامہ سے کہا کہ وہ اُسے اور اُس
کے درباریوں کو عشائے ربّانی دے۔ اُس نے سُریانی عبادت کا
طریقہ استعمال کیا لیکن (اس کے بعد رُوما میں کہنے لگے) "یہ طرزِ
عبادت تو مختلف ہے مگر رسم ایک ہی ہے"۔ چنانچہ شاہنشاہِ
انگلستان نے دو زانو ہو کر بیکن کے راہب کے ہاتھ سے عشائے
ربّانی لی۔ اگرچہ ابھی تک ساری دُنیا میں مسیحیت کا پیغام نہیں
پہنچا تھا تاہم اس سے کلیسیائے جامع کی حقیقت کا پتہ چلتا
ہے۔

پانچواں باب

مشرقی کلیساؤں کا انحطاط اور مغربی کلیساؤں کا زوال اور مستقبل کی اُمید

تیسرے باب میں کلیسا کے رُوحانی انحطاط کا ذِکر کیا گیا ہے کلیسا کے دُوسرے دَورِ زوال کو سمجھنے کے لئے
ہمیں ذیل کی دو باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔

اوّل۔ مشرق میں اسلام سے نقصان۔

دوم۔ مغرب میں کلیسیا کا زوال۔

اس کے بعد ہم کلیسیائی مستقبل کی اُمید کی چند باتوں پر سوچ بچار کر سکتے ہیں۔

۱۔ **مشرق کے نقصان**:۔ ساتویں صدی میں جب اسلام پھیلنے لگا تو وہ ممالک مثلاً فلسطین، سیریا، مصر اور شمالی افریقہ میں جہاں مسیحیت نے عرُوج حاصل کیا تھا، مسیحیت کمزور ہو گئی۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح ہُوا اور یُوں مشرقی یورپ بھی انحطاط اور زوال کے

علاقوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ لیکن سب سے پہلے ہم اُس علاقہ کا ذِکر کریں گے جہاں اسلام کو نقصان اُٹھانا پڑا۔ یہ ایسا علاقہ نہیں تھا جہاں اسلام کو شروع شروع میں بڑی طاقت نصیب ہُوئی تھی، بلکہ یہ ایسا علاقہ ضرور تھا جہاں پھلنے اور پھُولنے کے بڑے مواقع تھے۔ یہ علاقہ مشرقی اور وسطی ایشیا کا تھا۔ منگو خوانین مظاہر پرست تھے اور وُہ اپنی حالت پر مطمئن تھے۔ جب وُہ ہندوستان کے سوا ایشیا کے کثیر حصّہ پر حکومت کرنے لگے تو اُنہوں نے محسُوس کیا کہ وُہ ایشیا کے بڑے بڑے مذاہب میں سے کسی ایک کو اختیار کریں۔

مغرب میں اسلام، مشرق میں بدھ مت، اور تمام ایشیا میں مسیحیت پھیلی ہوئی تھی۔ چوتھائی صدی تک (یعنی ۱۲۶۹ء سے ۱۲۹۴ء تک) ایسا معلوم ہوتا رہا کہ وُہ مسیحی مذہب کو اختیار کر لیں گے۔ مارکو پولو کو پُورا یقین تھا کہ منگول مسیحیت کو ہی قبول کریں گے، چنانچہ وُہ رقمطراز ہے کہ "اگر پوپ نے ایسے آدمیوں کو بھیجا ہوتا جو مسیحیت کی منادی کے قابل ہوتے تو ضرور خانِ اعظم مسیحی ہو جاتا کیونکہ ہمیں وثوق سے معلوم ہے کہ اُس کے دِل میں مسیحیت کو قبول کرنے کی خواہش تھی۔"

قبلائی خان نے خود کہا تھا کہ "اس طرح لوگ وسیع پیمانے پر مسیحی ہو جائیں گے اور یہاں آپ کے علاقے سے بھی زیادہ لوگ مسیحی ہوں گے"۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذکورہ امداد کے وسیلے مسیحیت کو نئی قوت نصیب ہوتی اور منگولوں اور دیگر غیر چینی قوموں سے

مسیحیت چینیوں میں بھی پھیل جاتی اور اس سے پیشتر کہ ۱۵۲۶ء میں
بابر منگولوں کا لشکر جرار لے کر کوہ ہمالیہ کو عبور کر کے حملہ آور ہوتا اور
ہندوستان میں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھتا اور اس ملک میں مستقل
طور پر مذہب کے جھنڈے گاڑتا، وسطی ایشیا کے تمام منگول حلقہ
بگوش مسیحیت ہو چکے ہوتے اور ایشیا کی تاریخ مختلف ہوتی۔

یہ محض قیاس آرائیاں ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۳۰۰ء میں مشرق
میں منگول مسیحیت کی بجائے بدھ مت کی طرف اور مغرب میں اسلام
کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ ۱۳۶۸ء میں چینیوں نے منگول حکمرانوں
کو اپنے ملک سے نکال دیا اور چینی خاندان کی حکومت کو قائم کیا۔
غیر چینی قومیں مغرب کی طرف چلی گئیں اور ان کے ساتھ ہی دوسری
مرتبہ مسیحیت بھی چین کی سرزمین سے رخصت ہو گئی۔ تقریباً ۱۴۰۰ء
تک مسیحی اور نیم مسیحی قبائل وسطی ایشیا سے رخصت ہو چکے تھے ممکن
ہے کہ بہت سے مسیحی اسلام میں جذب ہو گئے ہوں اور باقی مسیحی
تیمور لنگ کی شمشیر کا لقمہ بن گئے۔ تیمور لنگ منگول تھا۔ اس نے
چنگیز خان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی اور قتل و غارت
کا بازار گرم کیا لیکن وسطی ایشیا میں اس کی تباہی و بربادی کے
آثار ہی رہ گئے۔ وہ خود بھی پکا مسلمان تھا اور وسطی ایشیا میں
اس کے پسماندگان بھی مسلمان تھے۔

ایشیائے کوچک میں بازنطینی[۵۱] سلطنت کی مشرقی حدود پر ایک

۵۱ BYZANTINE.

چھوٹا سا عثمانی ترکوں کا قبیلہ تھا۔ جب اس قبیلے نے قوت فراہم
کر لی تو اس کے ہاتھوں مسیحی سلطنت کو زبردست نقصان پہنچا۔
اس قبیلے نے ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ عثمانی فوج اتنی
زبردست تھی کہ اسے شکست نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس فوج میں
زیادہ تر غلام تھے جو بچپن سے ہی مسیحی گھرانوں سے زبردستی جدا
کر دیئے گئے تھے۔ انہیں علیحدہ رکھا جاتا تھا اور وہ فوج کی تمام
سختیاں برداشت کرتے تھے۔ یہ لوگ صرف جنگ و جدل کرنا
ہی جانتے تھے اس کے علاوہ ان کی زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا۔
۱۳۵۴ء میں عثمانی ترک یورپ میں پہنچے۔ چودھویں صدی کے آخر
تک انہوں نے بلقان کو فتح کر لیا تھا۔ ابھی تک قسطنطنیہ اس سلطنت
کا دارالحکومت تھا جس کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ قسطنطنیہ بھی
فتح ہونے کو تھا لیکن تیمور لنگ کی وجہ سے بچ رہا۔ وسطی ایشیا کا
یہ تباہ کرنے والا اپنے منگول گھوڑ سواروں کے ساتھ ایشیائے
کوچک پہنچا تاکہ عثمانی فوج اور عثمانی سلطنت کے پرخچے اڑا
دے۔ ۱۴۵۳ء تک وہ سلطنت از سر نو تعمیر ہو چکی تھی اور اپنا
کام سرانجام دینے کے لیے تیار تھی۔ قسطنطنیہ فتح ہو گیا۔ قسمت
کی ستم ظریفی تھی کہ رومی شہنشاہ کانسٹنٹائن یازدہم اسی شہر میں لڑتے
لڑتے قتل ہوا۔ اس وقت ظفریاب ترکوں کا سلطان محمد دوم تھا۔
۶۳۴ء اور ۶۴۰ء کے درمیان عربوں نے یروشلم، انطاکیہ اور

سکندریہ کو فتح کر لیا تھا۔ پس مغرب میں رومہ کے علاوہ قسطنطنیہ بھی جو ابتدائی کلیسیا کے اسقفی حلقہ مرجع تھا، اسلامی حکومت میں نہیں تھا۔ پانچویں صدی میں شمالی وحشی قوموں نے مغرب کی رومی تہذیب کو تاخت و تاراج کیا۔ قریباً ایک ہزار برس تک قسطنطنیہ مسیحی سلطنت کی روح و رواں بنا رہا، لیکن اب یہ ساری عظمت ختم ہو چکی تھی۔ سینٹ صوفیہ کا گرجا جو ۵۳۷ء میں تعمیر ہوا تھا اور مسیحی فن تعمیر کا نادر نمونہ تھا، مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ شہر کے نصف سے زیادہ گرجوں کو بھی اسی طرح مسجدیں بنا دیا گیا۔ کانسٹنٹائن کی مسیحی سلطنت کے اس دارالحکومت کو استنبول کا نام دیا گیا۔ یہ مقام غیر مہذب عثمانی سلطنت کا دارالحکومت بن گیا۔ جنوب مشرقی یورپ کی مسیحی سلطنت پر بڑا ظلم برپا ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ۱۹۱۸ء میں جب جنگ عظیم اول کا خاتمہ ہوا تو یہ دور بھی ختم ہوا، اور کلیسیا قائم رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت انتہائے شمال کے علاقے میں ہم ایسے واقعات کو رونما ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے مذکورہ نقصان کی تلافی ہوئی۔ روس نے ۱۴۸۰ء میں آئیون[1] سوم ”روس کے شہزادۂ اعظم“ کی سرکردگی میں منگولی جوئے کو اتار پھینکا۔ منگول اب مسلمان تھے۔ مسیحی کلیسیا کی زیر ہدایت، ماسکو اب ایک زبردست قومی اور ثقافتی زندگی کا مرکز بن

[1] IVAN.

چکا تھا۔ اب روسی یہ دعویٰ کرنے لگے کہ جس طرح ۳۳۰ء میں قسطنطنیہ کو ”نیا روم“ بنا دیا گیا تھا، اسی طرح قسطنطنیہ کی فتح پہ ماسکو ”تیسرا روم“ بن چکا تھا جو ”آرتھوڈاکس“ عقیدے کا محافظ تھا۔ ایک صدی تک اس قسم کے جذبات لوگوں کے دلوں میں رہے اور ۱۵۸۹ء میں ماسکو کے میٹروپالیٹن بشپ کو پیٹریآرک[1] کے عہدۂ جلیلہ پہ سرفراز کیا گیا۔ جوں جوں روسی تہذیب و تمدن شمال اور اس کے بعد مشرق کی طرف پھیلنے لگے تو اس کے ساتھ ہی راسخ العقیدہ مشرقی کلیسیا کی بھی اشاعت ہونے لگی۔

۱۳۵۰ء تا ۱۵۰۰ء کے عرصہ میں مغرب کی کلیسیائی وسعت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن مشرق میں کلیسیا نے بے شمار نقصانات برداشت کیے اور حقیقت یہ ہے کہ صرف دو علاقوں میں کلیسیا کی توسیع ہوئی اور اس کا شمار بڑھنے لگا۔ ۱۳۸۶ء میں لتھونیا[2] کا بادشاہ بھی مسیحی ہو گیا اور اس نے بپتسمہ لے لیا۔ لتھونیا شمال کی وہ آخری غیر مسیحی سلطنت تھی جس نے مسیحیت کو قبول کیا۔ پھر ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی سلطنت مسیحی طاقت کے سامنے سرنگوں ہوئی۔ جنوبی ہسپانیہ کی یہ آخری اسلامی سلطنت تھی۔

۴۔ مغرب میں کلیسیا کا زوال

اگرچہ مغرب میں مسیحی سلطنتوں کے علاقے کسی دوسری قوم نے فتح تو نہیں کیے لیکن مسیحی زندگی کے کئی شعبوں میں روحانی انحطاط کے

[1] PATRIARCH [2] KING OF LITHUANIA.

آثار نمایاں تھے، یہاں تک کہ پاپائے رُوم کی رُوحانی سلطنت پر بھی
زوال آنے لگا۔ تواریخ کلیسا میں ۱۳۷۸ء تا ۱۴۱۷ء کے دَور کو فرقہ پرستی
کا زمانہ کہتے ہیں۔ دو رقیب پوپ اُٹھ کھڑے ہُوئے اور ایک ایسا بھی
زمانہ تھا کہ ایک ہی وقت میں تین پوپ تھے۔ اس انحطاط کے دورِ اوّل
میں یعنی ۸۰۰ء تا ۹۵۰ء تک مغربی یورپ پر وحشت و بربریت کا دَور
دورہ رہا لہٰذا اتحاد و یگانگت کے لیے مغربی یورپ کی نگاہیں رُوم کی
طرف لگی ہُوئی تھیں۔ اب مغربی اقوام نے پوپیت کے حصے بخرے
کرنے شروع کر دیئے اور اپنی سیاسی سہولتوں کے مطابق وُہ ایک یا
دُوسرے پوپ کو تسلیم کرتے تھے۔ دُوسرے آثار سے بھی معلوم ہوتا
تھا کہ زمانۂ وسطیٰ، مرکزی کلیسا اور مسیحیت جو تہذیب و تمدن کی اساس
تھی ختم ہو رہے تھے۔ جاگیردارانہ معاشرتی زندگی کے بجائے مضبوط
قومی ریاست پیدا ہو رہی تھی اور اس قسم کی ریاست فرضی مافوق القومی
پوپیت کے مطالبات اور اُس کے اخراجات کے خلاف آواز اُٹھانے
کے لیے تیار تھی۔ پوپ بھی اپنے عظیم عہدے کی رُوحانی اہمیت کو
بحال کرنے میں قاصر تھے۔ پندرھویں صدی کے اختتام پر ایک ایسا
پوپ کلیسا کا رہنما ہُوا جو کلیسا کے لیے رسُوائی اور بدنامی کا باعث تھا۔
اُس کا اپنا چال چلن اہانت آمیز تھا اور وُہ ننگِ دُنیا تھا۔ سنہ ۱۵۰۰ء میں
یہ بات باور بھی نہیں کی جا سکتی تھی کہ مسیحیت کبھی بھی اپنے کھوئے ہُوئے
وقار اور قوّت کو حاصل کر سکے گی یا مغربی یورپ کی زندگی میں اسے مرکزی

حیثیت حاصل ہوگی، ہم اس بھیانک جائزے کا مختصر حال پیش کریں
گے۔ کلیسا کا سُریانی حصہ مشرق اور وسطی ایشیا سے مٹ چُکا تھا،
لیکن اس کا تھوڑا سا بقیہ فارس اور عراق میں رہ گیا تھا اور جُنوبی ہندوستان
میں اس کلیسا کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ کلیسا کا یُونانی حصہ اسلامی
حملوں سے بالکل کمزور ہو چُکا تھا۔ اب وُہ اپنی پہلی حالت کا ایک
دُھندلا سا نقش تھا۔ اُس کا مستقبل بڑا ہی محدود تھا لیکن رُوس
میں یُونانی کلیسا کی حالت قدرے بہتر تھی۔ لاطینی کلیسا رُو بہ زوال
تھی۔ پہلی صدیوں کی نسبت اب اس پر زیادہ اعتراضات ہونے لگے
تھے، اور مستقبل کی کیا اُمید ہو سکتی تھی؟

۴۔ مستقبل کی اُمید

اس باب میں جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے اُن کا ایک اور پہلو بھی
ہے۔ ہم نے مذہبی انحطاط اور زمانۂ وسطیٰ کے اختتام کا ذکر کیا ہے
لیکن پندرھویں صدی کو عقل و فکر کی ترقی اور دورِ جدید کی ابتدا کا زمانہ
کہا جا سکتا ہے۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح ہوا
اور اس کے ساتھ ہی مشرقی رُومی سلطنت کی موت واقع ہُوئی،
لیکن اسی عہد کی مظہر ایک اور تحریک تھی جسے احیائے علوم (نئی
پیدائش) کہتے ہیں۔ مغربی یورپ نے قدیم یُونانی رُومی تہذیب کو
اپنایا اور اس کا یہ اثر ہُوا کہ اٹلی میں مصوّری، سنگ تراشی، فنِ تعمیر و تحریر
مطالعۂ تاریخ، علوم و فنون کی تحقیق اور ایجادات کا شوق پیدا ہُوا۔

چین میں کتابیں چھاپنے کا پریس صدیوں سے جاری تھا لیکن اب ۱۴۴۸ء میں جرمنی میں از سرِ نو چھاپہ خانہ جاری ہُوا اور اس سے علم و ادب کی بے شمار نئی اور پُرانی کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہُوئیں، اور اِدھر اُدھر پھیلنے لگیں۔ ہم نے اس سے پیشتر بتایا ہے کہ ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی اسلامی سلطنت کو شکست ہُوئی ـــ چنانچہ یہ سال کرسٹوفر کولمبس[1] کے سمندری سفر کی وجہ سے مشہور ہے جس وقت ہسپانیہ کے جزیرہ نما سے اسلامی تسلط ختم ہُوا تو پرتگال اور ہسپانیہ کی دو سلطنتیں معرضِ وجُود میں آئیں۔ مشرقی بحیرہ رُوم اسلام کے زیرِ اثر تھا اس سے قسطنطنیہ کو شدید نقصان پہنچا کیونکہ قسطنطنیہ تجارت میں مشرقی ممالک کا درمیانی اجارہ دار تھا لیکن اب مغربی بحیرہ رُوم اور بحرِ اوقیانوس کے دونوں ممالک سمندری برتری حاصل کر رہے تھے مسیحیت کی ترقی اور توسیع کی خاطر اب ان ہی ممالک کی طرف آنکھیں لگی ہُوئی تھیں۔

پوپ نکولس پنجم[2] نے اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد ۱۴۵۴ء میں اُنھوں نے پرتگال کے بادشاہ کو فرمان جاری کیا اور لکھا کہ انڈیز[3] کے لئے کچھ اہتمام کیا جائے۔ اس تجویز میں نہ صرف یہ تھا کہ انڈیز کے غیر مسیحیوں کو خداوند مسیح کی خاطر جیتا جائے بلکہ اس جگہ کے مسیحیوں

ـــــــــــــــــــ

[1] سمی پوپ نکولس پنجم نے ۱۴۵۱ء میں گلاسگو یونیورسٹی کے اجرا کا فرمان جاری کیا۔ پوپ موصُوف احیائے علوم کے بڑے فاضل تھے۔

ـــــــــــــــــــ

[1] CHRISTOPHER COLUMBUS [2] POPE NICHOLAS.
[3] INDIES.

سے اتحاد بھی پیدا کیا جائے تاکہ اسلام پر غلبہ حاصل کیا جا سکے۔ پرتگال اور ہسپانیہ میں کئی صدیوں تک مُسلم اثر کے خلاف صلیبی جنگیں جاری رہیں۔ اِن جنگوں سے پرتگال اور ہسپانیہ بخُوبی واقف تھے، اس لئے جب وُہ دُنیا کی شاہراہوں پر جادہ پیما ہُوئے تو اُن میں بھی صلیبی جنگوں کی رُوح کار فرما نظر آنے لگی۔

پرنس ہنری (۱۳۹۴ء - ۱۴۶۰ء) نے جسے "نیوی گیٹر"[1] یعنی جہاز ران کہتے ہیں۔ حبشیوں سے پرتگال کا پہلا علاقہ سِیئُٹہ[2] جو افریقہ میں تھا فتح کر لیا۔ سیئُٹہ جبرالطارق کے عین سامنے ہے۔ اُس نے اپنی باقی ماندہ زندگی اسی کام میں صرف کی اور افریقہ کے ساحلی علاقوں کو دُور دُور تک مسخر کر لیا۔ اُس کے ایک ہم عصر سوانح نگار نے لکھا ہے کہ اُس کے سامنے ذیل کے پانچ مقاصد تھے:۔

۱۔ **دریافت و اکتشاف**:۔ وُہ نہ صرف افریقہ کو دریافت کرنے کا مُتمنّی تھا بلکہ وُہ افریقہ کے اِرد گرد ہو کر انڈیز تک پہنچنا چاہتا تھا۔

۲۔ **تجارت**۔

۳۔ وُہ اسلامی طاقتوں کو شکست دے کر اُن سے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔

۴۔ اُسے اُمید تھی کہ صحرائے اعظم کے جنُوب میں کسی مسیحی سلطنت سے دوستانہ مراسم اُستوار ہو سکیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیحی سلطنت حبشہ کے متعلق اُس کا علم بڑا غیر واضح تھا۔ اس وقت اُسے

ـــــــــــــــــــ

[1] NAVIGATOR [2] CENTAS.

پریسٹر جان سے متعلق سمجھا جاتا تھا)۔

۵۔ وہ خداوند یسوع مسیح کے دین کی اشاعت کرنا چاہتا تھا۔

۱۴۳۵ء میں پرتگیزی جہازران راس ٹوردو[۱] تک پہنچے اور صحرائے اعظم کو عبور کیا۔ ۱۴۶۲ء میں وہ سیرالیون پہنچے اور ۱۴۷۱ء میں انھوں نے خطِ استوا کو پار کیا۔ ۱۴۸۲ء میں ایک مہم نے گولڈ کوسٹ پر پہلے یورپین آبادکاروں کی ایک بستی قائم کی۔ انھوں نے اس جگہ نہ صرف پرتگال کا جھنڈا گاڑا بلکہ مغربی افریقہ کی سرزمین پر پہلی مرتبہ عشائے ربانی کی رسم ادا کی اور اس برِاعظم کے لوگوں کے لئے دعا کی کہ وہ مسیحی مذہب قبول کر لیں۔ ۱۴۸۴ء تک پرتگیز، کانگو تک پہنچ چکے تھے اور ۱۴۸۸ء میں بارتھولومیو دیاز[۲] راس امید تک پہنچ گیا۔ یہی وہ راس امید تھی جس کے پرے وہ شاہراہ واقع تھی جس سے وہ اسلامی سلطنت کو نیچا دکھا سکتا تھا اور انڈیز تک پہنچ سکتا تھا۔ اس کے پانچ سال بعد کولمبس نے اپنا بحری سفر شروع کیا۔ اس نے اس سے بھی زیادہ شاندار دریافت کی۔ وہ جنیوا کا رہنے والا تھا اور شاہِ ہسپانیہ کی سرکار میں جہازران تھا اور مغرب کی طرف دنیا کے اردگرد سفر کر کے انڈیز تک پہنچنا چاہتا تھا۔ ۱۴۹۲ء میں اس نے اپنے سفر کے متعلق یوں لکھا ہے :-

" کادیز[۳] سے روانہ ہونے کے تینتیس دن بعد میں بحرِ ہند میں پہنچا۔ یہاں میں نے بے شمار جزیرے دریافت کئے۔ پہلے جزیرے کا نام

---

۱ VERDE ۲ BORTHOLOME DIAZ ۳ CADIZ

چاروں بر اعظموں میں کاشت ۱۵۰۰ء تا ۱۶۰۰ء
جاپان
شمالی امریکہ
ایشیا
چین
پیکنگ
ہندوستان
دہلی
جنوبی امریکہ
آسٹریلیا
علاقوں میں پنسل سے رنگ کیا ہے ابھی تک دریافت نہیں ہوئے تھے
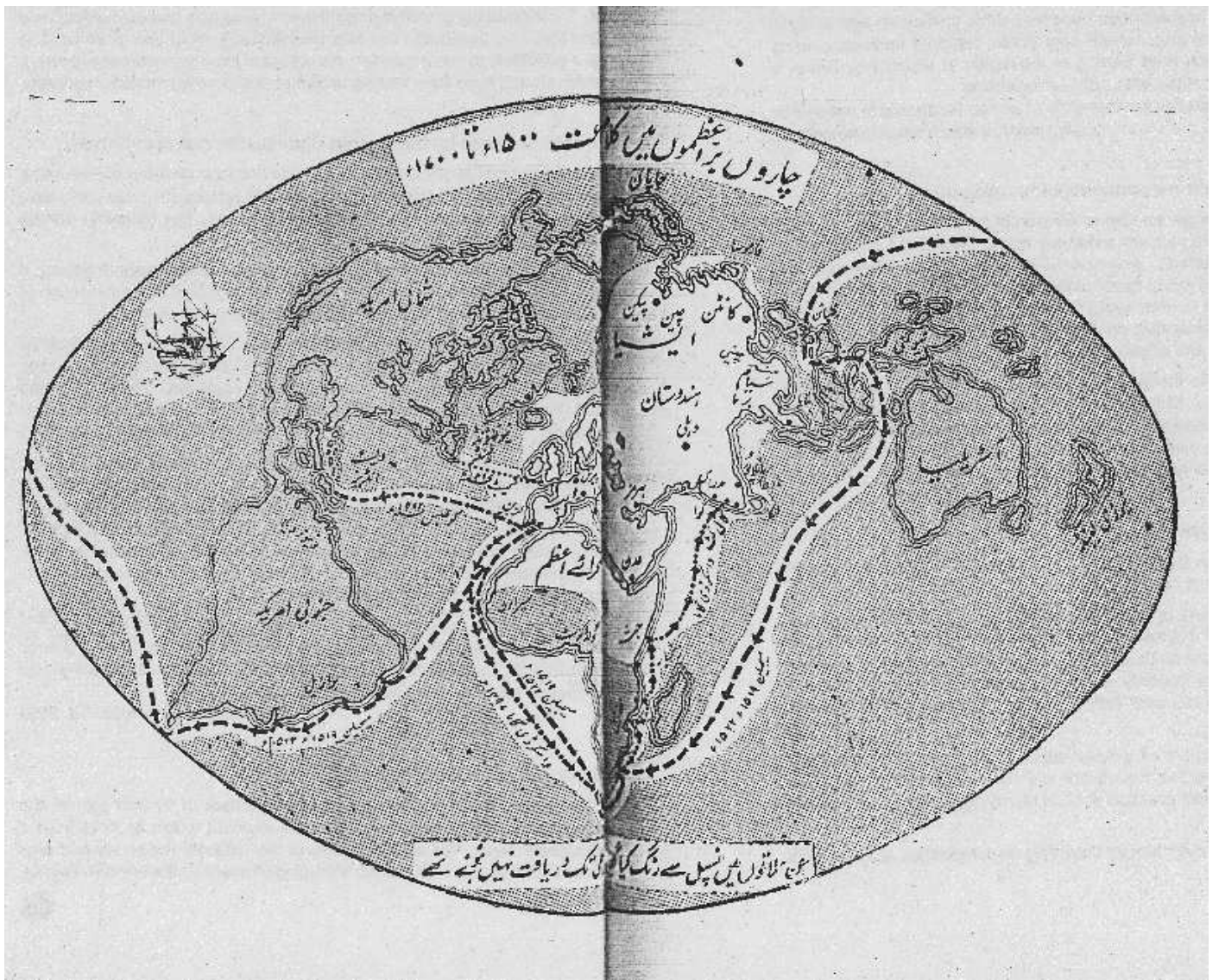
ہیں نے سان سالویٹر یعنی مُقدّس مُنجّی رکھا، کیونکہ اُسی مقدّس مُنجّی کے معجزہ سے پر میں یہاں تک پہنچا تھا۔"

اس سمندر کو بحر ہند کا نام دینے میں اُس نے جغرافیائی غلطی کی۔ یہ مُلک اور برّاعظم نہ ہی صرف غلط تھا بلکہ کرۂ ارض بھی غلط تھا۔ آج کل جب ہم ویسٹ انڈیز کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں (یعنی امریکن انڈیز) تو اس سے اُس کی غلطی کی یاد تازہ رہتی ہے۔ کولمبس نے اپنی روئداد میں لکھا ہے کہ اس جگہ کے باشندے ننگے اور وحشی ہیں۔ وہ بلیوں چابیوں، شیشوں اور چمڑے کی پٹیوں اور دوسری چیزوں کے عوض قیمتی اشیاء دینے پر رضامند نظر آتے ہیں۔ کولمبس نے لکھا ہے کہ میں نے انہیں بہت سی چیزیں دیں لیکن اُن سے کچھ نہ لیا۔ میں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تاکہ انہیں خوش کر سکوں اور وہ مسیحی ہو جائیں۔ جو قومیں ابھی تک گناہ کی تاریکیوں میں زندگی بسر کر رہی تھیں اُنہوں نے نجات کی روشنی دیکھی۔ وہ خداوند یسوع مسیح کی خوشی میں شریک ہوئے۔ ہم بھی خوشی منائیں کیونکہ ہمارے ایمان کو تقویت ملی ہے اور ہماری دولت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

اس کے پانچ سال بعد پرتگیزوں کی اُمید بر آئی۔ ۹۸-۱۴۹۷ء میں واسکوڈی گاما نے راس اُمید کو عبور کیا اور موزمبیق تک پہنچا۔ پھر بحیرۂ عرب سے ہو کر وہ کالی کٹ آیا۔ جہاز رانی کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ حضرت محمد صاحب سے قبل "مشرقی افریقہ

۱- SANSALVATER ۲- VASCODE GAMA.

کے ساحل اور بحیرہ عرب کے مشرقی ساحل پر عربوں کا تسلط تھا۔ پرتگیزوں نے دیکھا کہ ایشیا کے ساتھ تجارت کی اجارہ داری عربوں کے پاس ہے۔ ایشیا کی تمام تجارتی شاہراہوں پر اُن کا اختیار ہے اور کالی کٹ اس نظام کا مرکز تھا۔ اب اس مرکز پر پرتگیزوں نے قبضہ جما لیا اور عربوں کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے۔ پرتگیزوں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اگر انہیں ہندوستان کے ساحل پر اپنا قبضہ رکھنا ہے تو انہیں نہ صرف کالی کٹ کو اپنے اختیار میں رکھنا چاہیئے بلکہ اس کی طرف آنے والے تمام راستوں پر بھی اُن ہی کا قبضہ اور اختیار ہونا چاہیئے۔ ۱۵۱۵ء تک اُنہوں نے یہ قبضہ حاصل کر لیا۔ اُنہوں نے عربوں کے ہاتھ سے مشرقی افریقہ کی تمام بندرگاہیں چھین لیں اور اس کے ساتھ ہی عدن، ہرمز اور ملاکا پر بھی قبضہ جما لیا۔ یہ بندرگاہیں علی الترتیب بحیرۂ قلزم، خلیج فارس اور بحیرۂ چین کی کنجیاں تھیں۔ اس کے دو سال بعد ۱۵۱۷ء میں پرتگیزی جہاز جنوبی چین کے ساحل سے روانہ ہوئے اور ڈیڑھ صدی تک یورپ اور چین کے درمیان پہلا تجارتی رابطہ قائم ہوا۔ عربوں کی بحری طاقت کے خلاف اِن حملوں نے عربوں کی طاقت کا طلسم توڑ دیا۔ پرتگیزوں کے اس اقدام کو نئی قسم کی صلیبی جنگ سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ سلطانِ مصر نے ارضِ مقدس پر حملہ کرنے کی دھمکی تک دے دی کیونکہ وہ پرتگیزوں کے حملے کا بدلہ لینا

چاہتا تھا اور جب مسیحیوں نے ملاکا کو فتح کر لیا تو پوپ نے نماز شکرانہ ادا کی۔

اس اثنا میں اہلِ ہسپانیہ پر یہ حقیقت کھلنے لگی کہ جیسا کولمبس کا خیال تھا "انڈیز" ایشیا کا مشرقی ساحل نہ تھا بلکہ ایک براعظم تھا اور نئی دُنیا تھی۔ ۲۲-۱۵۱۹ء میں اہلِ ہسپانیہ نے سب سے شاندار کارنامہ سرانجام دیا۔ فرڈیننڈ میجلن ایک پرتگیز نے، جو ہسپانوی لوگوں کی ملازمت میں تھا، شرق الہند کے قصد سے جنوبی امریکہ کے جنوب میں بحری سفر کیا۔ اس مہم نے بحر الکاہل کو عبور کر کے جزائر فلپائن دریافت کئے۔ اُس وقت سے اب تک جنوبی امریکہ کی اس راس کا نام اُسی کے نام سے چلا آتا ہے۔ یوں سمندر کے راستے پوری دُنیا کے گرد دورہ پورا ہوا اور ثابت ہو گیا کہ زمین گول ہے اور نیز اگر مغرب کی سمت میں بحری سفر شروع کیا جائے تو مشرق میں پہنچ سکتے ہیں۔ میجلین سب سے پہلا شخص تھا جو نہ صرف انڈیز میں پہنچا جس کی عرصے سے تلاش تھی، بلکہ اُس نے سب سے پہلے کرۂ ارض کے ارد گرد بحری سفر بھی کیا۔

واقعات کی رفتار اب ہمیں ۱۵۰۰ء سے آگے لے آئی ہے۔ یہی سال ہماری منزلِ مقصود ہے۔ جب ہم ۱۵۲۲ء کے متعلق غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ساری دُنیا مغربی یورپ کے مسیحیوں کے سامنے کھلی پڑی ہے۔ اس سے پیشتر کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

مغربی یورپ کے مسیحی اب افریقہ اور امریکہ کے براعظموں میں جا سکتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ آسٹریلیا کے براعظم کے سوا تمام دُنیا میں یہ لوگ پہنچ چکے تھے۔

ہم یہ یاد کر کے حیران ہوتے ہیں کہ ان سالوں میں بہت سے خاص واقعات ظہور میں آئے۔ ۱۵۱۷ء میں جب پرتگیزوں کے بحری جہاز ملاکا سے چین کے ساحل پر پہنچے تو مارٹن لوتھر[1] نے وٹن برگ[2] میں پوپ کے مُعافی ناموں کے خلاف جہاد کیا۔ ۱۵۲۰ء میں جب میگیلن[3] کا جہاز دُنیا کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا تو اہل جرمنی نے پوپ کا وُہ فرمان جلا ڈالا جس میں لوتھر پر کُفر کا فتوےٰ لگایا گیا تھا۔ اس وقت تک اصلاح کلیسیا کی داغ بیل پڑ چکی تھی اور اسی وقت مغربی یورپ کی زوال پذیر مسیحیت میں از سرِ نو زندگی کا خُون دوڑنے لگا۔ رسل و رسائل اور مواصلات میں بڑی ترقی ہوئی۔ کلیسیا میں نئی زندگی کی رُوح آ گئی اور نئے نئے راستے دریافت ہُوئے۔ تاریخ کا یہی مطلب ہے کہ ایک واقعہ کا دُوسرے سے تعلق ہے۔ اس بے نظیر تبلیغی مساعی کی وجہ سے نئی زندگی کے سوتے پھُوٹے لیکن وُہ مسیحیت جو ان نئے راستوں پر جادہ پیما ہُوئی، وُہ وُہ مسیحیت نہ تھی جو پروٹسٹنٹ اصلاحِ کلیسیا کی تحریک سے پیدا ہُوئی بلکہ یہ وُہ مسیحیت تھی جو تحریکِ اصلاحِ کلیسیا کے خلاف تھی۔ یہ مسیحیت کے پھیلنے کا زمانہ تھا۔

۱؎ MARTIN LUTHER ۲؎ WITTENBERG ۳؎ MAGELLAN.

چھٹا باب

چار براعظموں میں انجیل کی خوشخبری

۱۵۰۰ - ۱۶۰۰ء

کلیسیا کے وُہ حصے جو رومہ سے جدا ہُوئے، دو وجوہات کی بنا پر دورِ جدید کی سہولتوں سے فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ تحریکِ اصلاحِ کلیسیا نے شمالی یورپ کے چھوٹے اور کمزور ممالک پر اثر ڈالا، جو اپنی آزادی کو برقرار رکھنے میں مشغول تھے لیکن دُنیا کی وُہ بڑی طاقتیں جو اپنی سلطنت کی توسیع اور تجارت بڑھانے میں لگی ہُوئی تھیں، اصلاحِ کلیسیا کے اثر سے دُور رہیں۔ لیکن اس میں دو مستثنات ہیں۔ انگلستان نے رومہ کے ساتھ اپنے تعلقات منقطع کر لیئے اور دریافتوں میں حصہ لیا۔ جان کیبٹ[1] نے ۱۴۹۷ء میں نیو فاؤنڈلینڈ[2] دریافت کیا۔ سولھویں صدی کے آغاز میں انگلستان نے ہسپانیہ کی بحری طاقت کو نیچا دکھایا اور شمالی امریکہ میں اپنی نو آبادیاں قائم کرنی شروع کر دیں اور ۱۵۹۶ء کے بعد ہالینڈ نے ہسپانیہ اور پرتگال کے ساتھ جنگ کی جس کے دو اسباب تھے:-

اوّل۔ وُہ اپنی قومی آزادی کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اور وُہ پروٹسٹنٹ

۱؎ JOHN CABIT ۲؎ NEW FOUNDLAND.

فرقہ کے حامی تھے، اس لئے اہل ہالینڈ نے اپنی بحری طاقت کو بڑھانا شروع کیا اور اپنی تجارت بڑھانے اور دوسرے مقامات پر اپنی بستیاں بھی بسانے لگے۔ لیکن پروٹسٹنٹ مشنری کام بہت تھوڑا ہوا۔

دوم۔ دوسرے ممالک میں پروٹسٹنٹ فرقہ کو اپنی حفاظت کی غرض سے کیتھولک فرقہ کے مقابلہ میں اتنی دیر تک جدوجہد کرنی پڑی کہ اُن میں اپنی برتری کا احساس پیدا ہو گیا۔ وہ آپس میں ہی بحث و تمحیص میں اُلجھ گئے اور اُنہوں نے دنیا کے اُن لوگوں میں کلام کی منادی نہ کی جنہیں کلام پاک کی ضرورت تھی۔ اُنہوں نے اپنی زیادہ قوت اسی بات کی مخالفت میں صرف کر دی کہ خدا کے کلام کو کس طرح پیش کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کے برعکس اُن کا فرض تھا کہ وہ بڑی دلیری سے دنیا کی قوموں کے سامنے کلام کی منادی کرتے۔ اُنیسویں صدی کے اوائل سے قبل غیر مسیحی دنیا میں پروٹسٹنٹ مسیحیت کی تبلیغ زیادہ نہ ہو سکی۔

تاہم سولھویں صدی مسیحی میں نہ صرف اصلاحِ کلیسیا کی تحریک زوروں پر تھی بلکہ نئی زندگی کا ایک نیا سوتا پھوٹ پڑا تھا جسے تاریخ تحریکِ مخالف اصلاحِ کلیسیا کہتی ہے۔ زندگی کے یہ دونوں سوتے ایک ساتھ پھوٹتے ہیں لیکن ان کے دھارے مختلف سمتوں میں بہنے لگتے ہیں اور یہ سمندروں کو بھی ایک دوسرے سے جدا کر دیتے ہیں۔ جان کیلون اور زیویر[1] ان دونوں سوتوں کی دو مشہور ہستیاں ہو گزری ہیں۔ جان کیلون فرانسیسی تھا۔ وہ ۱۵۲۳ء میں پیرس یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ زیویر ہسپانوی تھا۔

[1] XAVIER.

۱۵۲۵ء میں وہ بھی یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ ان اساتذہ کا جنہوں نے جان کیلون کو ایک عظیم مصلح بنا دیا تھا، زیویر اُن سے بڑا متاثر ہوا۔ ۱۵۲۹ء میں اُس کا ایک ہم وطن اور ہم جماعت جو عمر میں اُس سے بڑا تھا اُس کے ساتھ آشنا ہوا اور اُس کا دل موہ لیا۔ اُس کا نام اگنیشیس لویولا[1] تھا۔ زیویر پیرس کے علما کے گروہ میں سے پہلا وہ شخص تھا جو لویولا کی قیادت میں جمع ہوئے۔ اُنہوں نے اپنا نام کمپنی آف جیزز[2] رکھا۔ کیلون تحریکِ اصلاحِ کلیسیا کا بہت بڑا عالمِ دین تھا۔ زیویر اصلاحِ کلیسیا کی تحریک کی مخالفت، تحریک کا سب سے بڑا مشنری تھا۔ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ اُس نے بہت سے ممالک میں تبلیغی کام کیا تو اُس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ ایک عظیم المرتبت مشنری ہے۔

لویولا ہسپانیہ کا ایک رئیس تھا۔ ۱۵۲۱ء میں وہ ایک جنگ میں زخمی ہوا۔ بحالیٔ صحت کے دوران اُس نے خداوند یسوع مسیح کی طرزِ زندگی اختیار کی۔ اُس نے مسیحی ولیوں کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کیا اور خاص کر سینٹ فرانسس کی زندگی کی تقلید کی، چنانچہ اُس نے جنگ و جدل کو خیرباد کہا اور اپنے تمام ہتھیار پھینک دیئے اور ایک غار میں راہبانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ یہاں اُس نے روحانی ریاضت کے اصول وضع کیے۔ ریاضت کی یہ زندگی گیان دھیان کی چار ہفتہ وار منازل پر مشتمل ہے:۔

[1] IGNATIUS LOYOLA. [2] COMPANY OF JESUS.

اوّل:۔ اپنے گناہوں پر غور کرنا اور اُن سے توبہ کرنا۔

دوم:۔ نجات کے بانی اپنے خُداوند یسوع مسیح کی طرف غور کرنا کیونکہ وُہ ہمیں بُلاتا ہے کہ ہم اس دُنیا کو فتح کرنے میں اُس کی امداد کریں۔

سوم:۔ جب ہم اُس کے دُکھوں پر غور کرتے ہیں تو ہم اُس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں اور جب ہم اپنے گُناہوں سے توبہ کرتے ہیں تو ہم اُس کی آواز کو سُنتے ہیں۔

چہارم:۔ جب ہم اُس کی ظفر یاب قیامت اور صعُود پر غور کرتے ہیں تو ہم اُس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس ریاضت سے قوّت حاصل کر کے لویولا ارضِ مُقدّس کی زیارت کے لیئے روانہ ہُوا۔ فلسطین میں پہنچ کر اُسے معلُوم ہُوا کہ خُداوند مسیح کی خاطر اعلانِ جنگ کے لیئے ابھی اُس کے پاس ہتھیار نہیں ہیں لہٰذا وُہ ہسپانیہ واپس لوٹا۔ اس وقت اُس کی عُمر تینتیس برس کی تھی اور وُہ ایک مشہور سپاہی تھا۔ وُہ چھوٹے لڑکوں کی ایک جماعت میں داخل ہو گیا جو لاطینی سیکھ رہی تھی۔ اس طرح سے وُہ ہسپانیہ کی دو یُونیورسٹیوں میں داخل ہُوا۔ ۱۵۲۸ء میں وُہ پیرس چلا گیا۔

اُس کے ہم جماعتوں کا یہ گروہ کمپنی آف جیزز[1] کے حلقہ کے نام سے مشہور ہُوا۔ ۱۵۳۴ء میں اُس کے گیارہ ہم جماعتوں نے عشائے ربّانی لی اور غربت، پاکیزگی اور فرمانبرداری کا عہد کیا۔ اُنھوں نے یہ

[1] COMPANY OF JESUS.

بھی عہد کیا کہ وُہ ارضِ مُقدّس میں رُوحانی صلیبی جنگوں میں شامل ہوں گے اور اگر یہ ناممکن ثابت ہُوا تو وُہ پوپ کے زیرِ فرمان وہاں وہاں جائیں گے جہاں اُنہیں جانے کا حُکم ملے گا۔ ۱۵۴۰ء میں پوپ نے اس حلقہ کو کمپنی آف جیزز یا جیسوئٹس[1] کو منظور فرمایا۔ لویولا اس کا پہلا جرنیل منتخب ہُوا۔ اس حلقہ کا نشان اُس فوجی سپاہی کے نام سے ہے جس نے اس کی بُنیاد رکھی تھی۔ اس حلقہ کی تمام اصطلاحات فوجی ہیں مثلاً لفظ "کمپنی" یہ ایک فوجی دستہ ہے۔ جرنیل فوجی حاکم ہے اور روحانی ریاضتیں "یعنی فوجی قواعد اور اس کے ساتھ ہی فوجی ضابطہ یعنی احکام کی اشد ضروری اور فوری بجا آوری تھی۔ حکم خواہ کسی قسم کا ہو اُسے بجا لانا لازمی تھا۔ اگنیز ویئر کے معاملہ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ عثمانی ترکوں کی وجہ سے جیسوئٹس کا فلسطین میں داخلہ ممنُوع تھا لیکن جان سوم والئی پرتگال جسُوئیوں سے کہا کرتا تھا کہ وُہ ہندوستان میں پُرتگیزی مقبوضات میں جا کر کلام کریں۔ زیویئر اس وقت لویولا کے ساتھ رُوم میں تھا۔ اُسے اچانک اپنے دوست اور جرنیل سے یہ پیغام ملا "خُدا نے آج آپ کو ہندوستان کے لیئے منتخب کیا ہے۔ برادرم! جہاں کہیں خُدا آپ کو جانے کے لیئے ہدایت کرے وہاں جاؤ اور اپنے وجُود میں رُوح القُدس کی آگ روشن کرو۔"

زیویئر نے کہا "اچھا تو پھر چلیئے۔" اُس نے مختصر سا زادِ سفر لیا اور جہاز

[1] JESUIT.

پر سوار ہونے کی غرض سے لزبن کی بندرگاہ کی طرف چل پڑا۔ یہ لوگ کلیسیا کی زندگی میں نئی رُوح پھونکنے والے کہلاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے پیغام سے انقلاب پیدا کر دیا۔ بعض مشنریوں کو بڑے خطرناک کام سرانجام دینے کے لئے کہا گیا۔ وُہ علاقے جو اصلاحِ کلیسیا کی وجہ سے پوپ کے اقتدار سے نکل گئے تھے اُنھیں ازسرِنو تسخیر کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ وُہ پوپ کی قیادت کو قبُول کر لیں۔ زیویر کی طرح سے دیگر مشنری رؤسا کے پاس پہنچے۔ پرتگال اور ہسپانیہ کے دریافت کردہ علاقوں میں تبلیغ کا کام کوئی کم خطرناک نہ تھا۔ مشنریوں کا یہ حلقہ جسے "کمپنی آف جیسز" کہتے ہیں تحریکِ اصلاحِ کلیسیا کے خلاف ایک زبردست محاذ تھا لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اصلاحِ کلیسیا کے خلاف صرف یہی مشنری نہ تھے بلکہ کئی قدیم راہبانہ حلقوں میں بھی مشنری کام کا نیا جوش پیدا ہُوا اور قدیم طرز کے مشنری بھی تبلیغی خدمت پر مامور ہو کر کلیسیا کی خدمت کرنے لگے۔ جب ہم دُنیا میں مسیحی تبلیغی سرگرمیوں کا ذکر کریں گے تو ہم اس قسم کی کئی جماعتوں کا حال و احوال بیان کریں گے۔

لاطینی امریکہ برازیل پر پرتگیزوں کا قبضہ تھا اور اس وسیع و عریض علاقے کے باقی حصّے ہسپانیہ کے زیرِ اقتدار تھے جب اہلِ ہسپانیہ نے اس سرزمین کو فتح کیا تو انھوں نے میکسیکو[1] اور پیرو[2] کی ازٹک[3] اور انکا[4] کی تہذیبوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان

[1] MEXICO [2] PERU [3] AZTEC [4] INCA.

ممالک کے حکمران مُطلق العنان بادشاہ تھے اور ساری مملکت کا ایک ہی مذہب تھا۔ یہ لوگ اپنے حکمرانوں کے فرمانوں کو بجا لانے کے عادی تھے۔ لہٰذا جب اہلِ ہسپانیہ نے اپنی تہذیب اور مسیحیت کو رواج دینا شروع کیا تو لوگوں نے اُنھیں بلاپس و پیش قبُول کر لیا۔ ان دونوں تہذیبوں کے علاوہ امریکن انڈین خانہ بدوش قبیلے تھے۔ وُہ سیر و شکار کے دلدادہ تھے اور اپنے آباؤ اجداد کی ارواح اور اپنے قبائل کے دیوتاؤں کی پُوجا کیا کرتے تھے۔ اہلِ یورپ کو اس قسم کی زندگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ لوگوں کو کام کرنا سکھانا چاہیئے۔ اور اُن سے کام لینا چاہیئے۔ اس لئے جب اہلِ یورپ نے سمندر پار علاقوں میں اپنی بستیاں قائم کرنا شروع کیں تو ان علاقوں کو فتح کرنے میں قتل و غارت، ظُلم و استبداد اور تباہی کا وُہ بازار گرم ہُوا کہ الامان والحفیظ۔ اس زمانے کی تاریخی داستان خُون سے رنگین ہے۔

ہسپانیہ اور پرتگال کے حکمرانوں کے پیشِ نظر اعلیٰ مقصد یہ تھا کہ وُہ ان بستیوں کے لوگوں کو مسیحی بنائیں۔ . . . . لیکن اُن کی یہ کوشش بڑی ظالمانہ اور غیر انسانی تھی۔ حکمرانوں کے اذہان میں دراصل یہ پالیسی تھی کہ ہسپانیہ کے آبادکار اس مُلک کی زمینوں پر قابض ہو جائیں اور یُوں وُہ اس مُلک کے باشندوں کی جسمانی اور رُوحانی فلاح و بہبُود کے ذمّہ دار ہوں۔ ۱۴۹۲ء میں جب کولمبس نے اس براعظم کو دریافت کیا تو اُس نے فرطِ مسرت سے اپنی ڈائری میں ذیل کے الفاظ

قلمبند کیئے۔

"ہمارے ایمان کو تقویت ملی ہے اور ہماری دولت میں بھی اضافہ ہُوا ہے"۔ لیکن بہُت سے آباد کاروں کے پیشِ نظر دُوسرا مقصد یہی تھا کہ وُہ دولت سمیٹنے کے درپے تھے۔ اگرچہ اہلِ ہسپانیہ کی حیثیت پدرانہ تھی تاہم اُنہوں نے اہلِ مُلک کے ساتھ اس مسیحی رشتہ میں نہ تو کچھ احتیاط کی اور نہ اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔

کلیسیا نے دو قسم کی خدمات سرانجام دیں۔ وُہ مظلوموں کی حامی تھی اور خانہ بدوشوں کو تہذیب و تمدّن سکھاتی تھی۔ خادمانِ دین راہبوں اور مذہبی رہنماؤں نے مفاد پرستی کے خلاف احتجاج کیا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور شخصیت بارتولومی ڈی لاز کاساس[1] (۱۴۸۴-۱۵۶۶) کی تھی۔ یہ شخص ایک جہازران کا بیٹا تھا جس نے کولمبس کے ساتھ امریکہ کا بحری سفر کیا تھا۔ وُہ امریکہ میں آباد کار کی حیثیت سے آیا تھا۔ وُہ خادمِ دین بنا اور لوگوں کی بہتری و بہبُودی میں اپنی زندگی صرف کر دی۔ اِس مُلک کے لوگوں کی حمایت کے لئے وُہ ہسپانیہ بھی پہنچا اور جب وُہ واپس آیا تو اُسے "انڈینز کا محافظِ اعظم" کے نام سے موسُوم کیا گیا۔ اُس کے متعدّد ہم وطن اُسے ایسا جنُونی کہنے لگے جس کی ہمدردیاں اس مُلک کے اصلی باشندوں کے ساتھ تھیں۔ ہم اس مقدس ہستی کو اس مُلک کے قدیم باشندوں کی حفاظت کا رہنما کہہ سکتے ہیں۔ اُس نے اپنے اصُولات کے اظہار کے لئے

۱؎ BARTOLOME DE LAS CASAS.

وینزوویلا[1] میں ایک بستی قائم کی۔ ہسپانوی حکُومت نے مشنریوں کی حوصلہ افزائی کی اور وُہ جوق در جوق اس مُلک میں آنے لگے۔ اب پہلے سے بہتر پالیسی وضع کی گئی اور یہ خیال جاتا رہا کہ ہسپانوی لوگ اس زمین کے زمیندار ہیں اور اُن کا حق فائق ہے۔ مشن قائم ہُوئے اور مرکز میں گرجا تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد زراعت کے لئے زمینیں تھیں، عمارتیں اور کارخانے تعمیر ہُوئے۔ اِن کے اِرد گرد لوگوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ خانہ بدوش اور شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرنے والے باشندے مُستقل طور پر ایک جگہ گاؤں میں رہنے لگے۔ اب وُہ تہذیب کی ابجد سے بھی رُوشناس ہُو گئے۔ یہ ہسپانوی تہذیب تھی اور یہ سب کچھ مشنریوں کی بدولت ہو رہا تھا۔ لیکن اِن مشنریوں کا نظم و ضبط بڑا سخت تھا۔ وُہ ان لوگوں پر حکُومت بھی کرتے اور اُنہیں تعلیم بھی دیتے تھے۔ سترھویں صدی پیراگوئے[2] کی سب سے اچھی بستیاں تھیں جو جیسوئٹس کی نگرانی میں تھیں۔

شمالی یورپ میں مسیحیّت کی تبلیغ و اشاعت کرنے والے مشنریوں کا کسی نہ کسی مذہبی راہبانہ حلقہ سے تعلّق تھا۔ اسی طرح امریکہ کے مشنری بھی کسی نہ کسی حلقہ سے منسلک تھے۔ اب خانقاہوں کی بجائے یہ بستیاں قائم ہو گئیں۔ خانقاہیں تو محدُود پیمانے پر مسیحی برادری کے نمونے تھے، لیکن اِن بستیوں میں مشنری تھے جن کے ہاتھوں میں اِن ساری بستیوں کا انتظام تھا اور ساری آبادی اُن

۱؎ VENEZUELA ۲؎ PARAGUAY.

کے زیرِ فرمان تھی۔ یورپ میں مشنری اور باشندے ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے تھے لیکن جنوبی امریکہ میں وہ ایک دوسرے سے بالکل اجنبی تھے۔ یورپ میں ابھی لوگوں کو مسیحیت قبول کئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ اُن میں سے بشپ اور مشنری مقرر کئے گئے۔ جنوبی امریکہ میں قیادت اہلِ یورپ کے ہاتھوں میں رہی، لیکن پیراگوئے میں ایک سو پچاس سال کے بعد بھی امریکن انڈین میں سے کسی کو خادم الدین مقرر نہ کیا گیا۔ اِن بستیوں میں جو کچھ ہوا ہے اس سے مسیحیت کی کچھ عزت افزائی نہیں ہوئی۔ وہ مسیحیت جو اس ملک میں شروع ہوئی اور پنپنے لگی بڑی حقیر قسم کی تھی۔ ان مسیحیوں میں کئی بت پرستی کی رسومات تھیں، لیکن پھر بھی لاطینی امریکہ نے مسیحیت کو قبول کیا جو مسیحی سلطنت کا ابھی تک حصہ ہے۔

۳۔ فلپائن جزائر[1]:- یہ جزائر لاطینی امریکہ سے بہت دُور ہیں۔ ان جزائر کا لاطینی امریکہ کے ساتھ ہی مطالعہ کرنا ضروری ہے کیونکہ ان کی حالت بھی اسی قسم کی تھی۔ اہلِ ہسپانیہ اس پر اپنا اقتدار سمجھتے تھے۔ ان جزائر کے باشندے غیر مہذب تھے۔ اُنھوں نے بڑی سُرعت سے ہسپانیہ کی تہذیب اور مذہب کو اپنا لیا لیکن پہاڑی قبائل ابھی تک اپنی طرزِ زندگی بسر کرتے رہے تاہم ان میں ایک فرق ضرور تھا۔ یہ علاقہ بہت دُور دراز واقع تھا۔ لہٰذا تجارتی نقطۂ نگاہ

---
[1] THE PHILIPPINES.

سے اِس کی خاص اہمیت نہ تھی۔ اِس سلسلہ میں کولمبس کے دو محاورے لکھے جاتے ہیں جن میں "ایمان کی تقویت" کو "دولت" پر ترجیح دی گئی ہے۔ سنہ ۱۵۹۰ء اور سولھویں صدی کے اختتام تک آبادی کا بیشتر حصہ مسیحی ہو چکا تھا۔ ایشیا میں آج کل یہی ایک ملک ہے جو مسیحی کہلاتا ہے۔

۴۔ اب ہم پرتگیزی علاقہ میں داخل ہوتے ہیں۔ ساتویں صدی میں شمالی افریقہ سے اسلام رخصت ہو چکا تھا۔ مصر میں قبطی مسیحی اقلیت میں تھے۔ حبشہ میں مسیحیت سرکاری مذہب تھا لیکن اس کے چاروں طرف اسلامی ممالک تھے۔ کیا وہ مسیحیت جو اس وقت سمندر کے راستہ اس ملک میں آئی تھی، اسلام کو ہٹا کر صحرائے اعظم کے جنوب میں قائم ہو سکتی تھی؟ اب چونکہ یہ برِّاعظم دریافت ہو چکا تھا تو کیا مسیحی قومیں مستقل طور پر اس پر چاروں طرف سے قبضہ جما سکتی تھیں؟

لیکن مقامِ افسوس ہے کہ اہلِ یورپ نے افریقہ کی اہمیت سے چشم پوشی کی۔ اُنھوں نے افریقہ کے متعلق بس اتنا ہی معلوم کرنا گوارا کیا کہ مشرق کے راستہ میں یہ برِّاعظم حائل ہے۔ دوم یہ ایک ایسا ملک ہے جس سے جنوبی امریکہ کی بستیوں کے لئے غلام مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ پرتگیزوں اور ہسپانوی لوگوں کو معلوم تھا کہ اُن کے ہمسایہ اسلامی ممالک میں حبشی غلاموں کی تجارت عام

عام ہے۔ عام خیال تھا کہ "افریقہ کے ایک حبشی غلام کا کام چار امریکن انڈین کے کام کے برابر ہوتا ہے" پس اُنہوں نے ہزاروں کی تعداد میں حبشی غلاموں کو امریکہ میں بھیجنا شروع کیا۔ اس سے مغربی افریقہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پوپ لیو دہم[1] جس نے ۱۵۴۲ء میں کو تفر کی مخالفت کی تھی، غلاموں کی تجارت کو بھی بُرا فعل قرار دیا اور کہا کہ یہ قوانین خدا کے خلاف ہیں۔ افریقہ میں مشنریوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اُن کے کام سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہُوا اور نہ اُن کی مساعی کو دوام حاصل ہُوا۔

۱۵۰۰ء میں افریقہ کے مغربی ساحل پر اور کانگو میں چند افریقی سرداروں نے بپتسمہ لیا۔ اِن سرداروں کا پرتگیزوں کے ساتھ ملنا جلنا تھا۔ اس کے بعد ۱۵۶۰ء میں ایک افریقی حکمران اور اُس کی والدہ نے مسیحی مذہب قبول کیا۔ یہ سردار دریائے زمبیزی[2] کی وادی میں بنٹو[3] سلطنت کا فرمانروا تھا۔ ۱۵۶۱ء میں اس فرماں روا نے مسیحیت کو خیر باد کہا اور ایک جیسوئٹ مشنری سلویرا[4] کو موت کے گھاٹ اُتروا دیا۔ تختۂ دار پر چڑھنے سے پیشتر سلویرا نے کہا "میں موت کا تلخ جام نوش کرنے کا بڑا ہی مشتاق ہُوں۔ میں اُنہیں معاف کرتا ہُوں"۔ ایک صدی بعد ایک اور حکمران نے مسیحی مذہب قبول کیا اور بڑی خوشی کی گئی۔ یہ ۱۶۵۲ء کا واقعہ ہے جب ولندیز جنوبی افریقہ کے ساحل پر آباد ہو رہے تھے۔ پرتگیزوں کی بحری

[1] POPE LEO X. [2] ZABESI [3] BANTU [4] SILVEIRA

طاقت کا خاتمہ قریب تھا اور اس کے بعد افریقہ کے ساحلی علاقوں میں مسیحی مشنوں کے کام کا بھی خاتمہ ہونے کو تھا۔ مسیحیت نے صحرائے اعظم کے جنوب میں حبشی افریقہ میں تبلیغ کا سلسلہ شروع تو کیا لیکن اُن کی یہ کوشش ناکام ثابت ہُوئی۔

ہم ہندوستان:- گوا کی بندرگاہ ہندوستان کے مغربی ساحل پر تھی۔ یہ مقام پرتگیزوں کا ایک مشہور صدر مقام بن گیا۔ ۱۵۳۳ء میں اسے اُسقفی حلقہ بنا دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد یہ مقام اُسقفِ اعظم کا حلقہ بن گیا جسے جنوبی افریقہ سے اختیارات حاصل ہوتے تھے اور اس کا اختیار جاپان پر بھی تھا۔ گوا میں غیر مسیحیوں کے متروکہ مقامات کو مسمار کر دیا گیا اور جلدی ہی کئی قوموں کے خُون کی آمیزش سے ایسی آبادی بڑھنے لگی جو نام نہاد مسیحی تھی لیکن وہ مسیحی تعلیم اور مسیحی شعار سے بالکل نابلد تھی۔ اس مسیحی برادری میں نیچ ذات کے ہندوستانی شامل ہو گئے۔ اِن لوگوں کو یا تو مجبور کیا گیا اور یا اُنہیں دنیاوی لالچ دیا گیا۔ اِن حالات میں ۱۵۴۳ء میں فرانسس اگزیویئر ہندوستان میں آیا۔ اُس نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ گوا تبلیغی لحاظ سے ایک اہم مقام ہے۔ اُس نے لویولا[1] کو خط تحریر کیا اور یہ اُمید ظاہر کی کہ مستقبل قریب میں "تین سو جوانوں کو پاسبانی کی تربیّت دی جائے گی۔ یہ نوجوان مختلف نسلوں اور قوموں سے ہوں گے اور اُن کی بولی بھی

[1] LOYOLA.

ایک دُوسرے سے مُختلف ہوگی۔ اُس نے فوراً اپنے پاسبانی فرائض کو محسُوس کیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک گھنٹی ہُوا کرتی تھی۔ وُہ بازاروں میں پھرا کرتا تھا اور اُونچی آواز سے پُکار پُکار کر کہا کرتا تھا "اپنے بچّوں اور ملازموں کو مسیحی دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جماعت میں بھیجا کرو۔" وُہ لوگوں کے گھروں میں ملاقات کے لئے جایا کرتا تھا اور مذکورہ بچّوں کے والدین کو باضابطہ طریق پر شادی کرنے کی تلقین کیا کرتا تھا۔ زیویر کی رائے میں ایک مسیحی فرمانروا کی خاص خاص ذمہ داریاں تھیں۔ ۱۵۴۵ء میں اُس نے پُرتگال کے بادشاہ جان سوم کو لکھا کہ وُہ لوگ جو بُت بنائیں یا کسی پجاری کو پناہ دیں اُنہیں سخت سزا دی جائے اور وُہ لوگ جو مسیحی مذہب قبُول کریں اُنہیں انعامات دیئے جائیں۔

"عالیجاہ بادشاہ سلامت! حضُور جن لوگوں کو دُوسرے مقامات پر حاکم بنا کر بھیجیں اُنہیں تلقین فرمائیں کہ وُہ مسیحی دین کی اشاعت اور ترقی میں کوشاں رہیں۔ یہی اُن کا فرضِ اوّلین ہے نیز آپ گورنر یا مقامی حاکم کو اس کا ذمّہ دار ٹھہرائیں اور یہ کام خادمانِ دین کے ہی سپُرد نہ کیا جائے۔"

ہم اس کے اس اقدام کو سراہتے ہیں کہ اُس نے لے[۱] مین کی ذمّہ داریوں اور مسیحی اہل کاروں کی اہمیّت پر زور دیا ہے۔

ہندوستان کے جنُوبی حصّہ میں پرواش[۲] قوم کے غریب ماہی گیر رہتے تھے۔ اُنہوں نے مسلمان بحری قزاقوں سے پرتگیزوں کی پناہ لی ۱۵۳۲ء

۱ LAYMEN ۲ PARVAS.

میں خادمانِ دین نے بیس ہزار ماہی گیروں کو بپتسمہ دیا۔ یہ کام زیویر پر چھوڑ دیا گیا تاکہ وُہ ان کی تعلیم و تربیّت کا کوئی انتظام کرے۔ وُہ ہندوستان میں زیادہ عرصہ نہ ٹھہرا، اس لئے اُسے تامل زبان سیکھنے کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔ اُس نے عقیدہ، دس احکام، دُعائے ربّانی اور چند دُوسری دُعاؤں کا خام سا ترجمہ کیا۔ وُہ لکھتا ہے:-

"میں نے عقیدہ، دس احکام، دُعائے ربّانی اور دُوسری دُعاؤں کو زبانی یاد کیا۔ پھر میں اِدھر اُدھر پھرا کرتا تھا اور میں جتنے آدمی اور لڑکے اکٹھے کر سکتا تھا اُنہیں میں دن میں دو مرتبہ تعلیم دیا کرتا تھا۔ ایک ماہ میں اُنہیں دُعائیں یاد ہوگئیں اور میں نے لڑکوں کو تاکید کی کہ وُہ اپنے ماں باپ اور ہمسایوں کو بھی یہ تعلیم سکھائیں۔"

اب ہر ایک گاؤں میں عبادتوں کا سلسلہ شروع ہونے لگا اور لوگ اتوار کی عبادت کے لئے خادم الدین کی انتظار بھی نہیں کیا کرتے تھے۔ اُن کی نمازیں ہی سادہ سی باتیں شامل تھیں۔ یہ پرواس لوگ اب تک مسیحی ہیں۔ بیسویں صدی میں اُن کے ہندوستانی حلقہ اُسقفی سے پہلا صلیبی بشپ مقرر ہُوا ہے۔ یہ بشپ رومن کیتھولک کلیسیا کا ہے۔

پرتگیزوں نے معلُوم کیا کہ ہندوستان میں سُریانی کلیسیا موجُود ہے جس کا مُقدس توما رسُول سے تعلّق ہے۔ ۱۵۰۲ء میں واسکوڈی گاما کوئلن[۱] پہنچا۔ سُریانیوں نے ان زبردست مسیحی ہمسایوں کا خیر مقدم کیا۔

۱ QUILIAN.

پرتگیزوں نے اِن کے ساتھ اپنی محبت کا یوں اظہار کیا کہ اُن کی حفاظت
کی جائے اور اُن کے گرجوں کی عمارتیں بھی بحال کی جائیں۔ اِن
عمارتوں میں سے سب سے مشہور توما رسول کا مقبرہ مائلاپور[1] میں ہے۔
۱۵۴۷ء میں اس مقام کے قریب پرتگیزوں کو ایک پتھر کی پرانی
صلیب ملی۔ بہت جلدی ہی سُریانیوں نے یورپی پادریوں کی
شکایت کرنا شروع کر دی کہ وہ اُنہیں اپنا مرید بنا رہے ہیں چنانچہ
اہلِ یورپ سُریانی بدعت کا گلہ کرنے لگے۔ گوا میں ایک نیا آرچ
بشپ مقرر ہوا۔ اُس نے نئی پالیسی کا اظہار کیا۔ ۱۵۹۹ء میں اُس
نے اس مشرقی کلیسیا کی سنڈ یعنی ڈایامپر کی سنڈ[2] کو ترغیب دی کہ
وہ روما کی قیادت کو قبول کریں۔ نصف صدی تک یہ فتح مکمل نظر
آتی رہی۔ ادھر پرتگیزی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور ۱۶۵۳ء میں
بغاوت کے آثار نمودار ہوئے۔ سُریانی کلیسیا کے جس حصّہ نے
آزادی حاصل کر لی تھی اُس کا کوئی بشپ نہ تھا۔ پس ۱۶۶۵ء میں انہوں نے
اپنے آرچ ڈیکن کی تقدیس کی اور اُس نے بخوشی اس اعزاز کو قبول
کیا اور وہ بشپ مقرر ہوا۔ لیکن یہ بشپ مشرق کی کلیسیا کا نہ تھا۔
(نسطوری) بلکہ یہ نام نہاد انطاکیہ کے پیٹریارک جیمز کے زیرِ نگرانی
مشرقی کلیسیا تھا جو اُسے سربراہ تسلیم کرتی ہے۔ نہ دانستہ طور پر اُس سے
بھی نسطوریس جیسی غلطی کا ارتکاب ہوا ہے یعنی اُس کا "ایک فطرت
پر" ایمان تھا۔ اس کا یہ مفہوم ہے کہ ہمارے خداوند یسوع مسیح میں

1 MAILAPUR 2 THE SYNOD OF DIAMPER.

الٰہی اور انسانی فطرت موجود تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیحی دینیات میں مغرب
اور مشرق میں جو مذہبی اختلافات تھے اُس کی وجہ یہ تھی کہ یونانی اور
لاطینی اور سُریانی اصطلاحات کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا تھا۔ ۱۶۶۵ء
میں اس بات کی ضرورت تھی کہ ہندوستان کے جنوب میں رہنے والے
سُریانی مسیحیوں کا اپنا بشپ مقرر کیا جائے۔

۱۵۲۶ء میں جب پرتگیز ہندوستان کے ساحلوں پر اپنا تسلط جما
رہے تھے تو کوہ ہمالیہ کے دروں کے راستے بابر ایک بہت بڑا لشکر لے
کر ہندوستان میں وارد ہوا۔ وہ اس ملک میں مغلیہ سلطنت قائم کر کے
دہلی کے پایۂ تخت سے کُل ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ بابر
کے پوتے اکبر اعظم نے مغلیہ سلطنت کو بہت وسعت دی اور اسے
ہر لحاظ سے مستحکم کیا۔ اُس نے مختلف مذاہب کے لوگوں مثلاً ہندوؤں
بُدھوں، پارسیوں اور مسیحیوں کو اپنے دربار میں جمع کیا۔ اُسے حق کی
تلاش تھی اور ان ادیان کے عُلما سے وہ اُن کے مذاہب کی باتیں
معلوم کیا کرتا تھا۔ وہ اپنے مسلمان علما سے بھی شرعی مسائل پوچھا کرتا
تھا۔ اُسے مذہبی معاملات میں بڑی دلچسپی تھی۔ ۱۵۷۹ء میں اکبر اعظم نے
گوا کے جیسوئٹ[1] کالج سے کہا کہ وہ اُس کے دربار میں مسیحی علما بھیجے چنانچہ
اُس کے دربار میں تین مسیحی علما حاضر ہوئے اور اُن کے دل میں قوی اُمید
تھی کہ وہ شہنشاہ کو مسیحی بنا کر سارے ہندوستان کو مسیح کی خاطر جیت
لیں گے۔ شہنشاہ نے اس مشن کے تمام اخراجات برداشت کیے۔

1 JESUIT.

اور تقریباً نصف صدی تک اس مشن کو تمام قسم کی مراعات حاصل رہیں لیکن بہت تھوڑے لوگوں نے مسیحیت کو قبول کیا۔

۱۶۰۵ء میں رابرٹ ڈی نوبلی جو ایک اطلی نژاد امیرزادہ تھا اور ایک مشہور کارڈینل کا بھتیجا تھا، جنوبی ہندوستان کے شہر مدورا[1] میں آیا۔ یہ شہر ہندو تامل تہذیب اور ثقافت کا مرکز تھا۔ اُسے اس بات سے بے حد دُکھ ہُوا کہ مسیحیوں کو "فرنگی" یا یورپین کہا جاتا ہے، اور کلیسیا میں بہت کم لوگ ہیں اور نیز وہ جو مسیحی ہُوتے ہیں، نیچ اقوام سے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ہندوستان کو مسیحی بنانا ہے تو مسیحیت کو ہندوستانی ہونا چاہیئے اور برہمنوں کو مسیحی کرنا چاہیئے پس ہندوستانی اصطلاح میں وہ ایک نیک اور پارسا شخص بن کر زندگی بسر کرنے لگا۔ اُس نے مغربی رسُومات کو خیرباد کہا اور ہندوستانی لباس زیب تن کیا۔ اُس کی خوراک اور رہائش بھی ہندوستانیوں جیسی تھی۔ وہ تامل زبان میں گفتگو کرنے لگا اور اطلی زبان ترک کر دی۔ یہ کام بڑا کٹھن تھا۔ وہ پہلا یورپین تھا جس نے سنسکرت زبان کے علم و ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہ خود اپنے کام کا یُوں ذکر کرتا ہے۔

"جونہی مَیں نے زبان پر عبُور حاصل کر لیا مَیں نے اجتماعی اور انفرادی طور پر برہمنوں سے بحث مباحثہ شروع کیا۔ برہمن سرزمین ہند کے علما و فضلا شمار کیئے جاتے ہیں۔ امسال (۱۶۰۹ء) میں پچاس عالموں نے بپتسمہ لیا ہے۔ یہ شہر علم و فضل اور سیاست کا

[1] MADURA.

مرکز ہے، اس لیئے کسی دُوسرے مقام کی نسبت اس مقام پر کسی کو مسیحی بنانا زیادہ مشکل ہے۔"

مدورا مشن[1] نے بڑی سرعت سے ہر سال ایک ہزار مسیحی بنانے شروع کر دیئے لیکن ان میں سے بہت تھوڑے برہمن تھے۔ بعض برہمن جنہیں بڑی آسانی سے قائل کر لیا گیا تھا پھر واپس لوٹ گئے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس قسم کی پالیسی بُت پرستی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے مترادف ہے۔ اس کے بعد ۱۶۲۳ء میں روم سے ایک فیصلہ صادر ہُوا جس نے تمام معترضین کو خاموش کر دیا۔ ڈی نوبلی کی وفات کے بعد ۱۶۵۶ء میں دوبارہ مخالفت کا طوفان اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ بحث مباحثہ "مالاباری رسُومات"[1] کے نام سے موسوم ہے جو ۱۷۴۴ء تک جاری رہا۔ اس موقع پر رُوم نے ہندوستانی رسُومات کو اپنانے پر سختی سے پابندی عائد کر دی۔ اگر مدورا مشن نے ڈی نوبلی سے پیشتر مسیحیت کو ہندوستانی بنانے کی کوششیں کی ہوتیں تو مسیحیت پرتگیزی مسیحیت نہ ہوتی۔ بہت تھوڑے مشنری ایسے ہیں جو کسی دُوسرے ملک میں جا کر جانفشانی سے کام کرنے کے اہل ہوتے ہیں وہ مُقدس پولُس رسُول کے الفاظ میں کہتے ہیں "ہم اپنی نہیں بلکہ مسیح یسُوع کی منادی کرتے ہیں"۔

۵۔ لنکا میں مسیحیت کو بڑی کامیابی حاصل ہُوئی اگرچہ یہ کامیابی دیرپا نہ تھی۔ ۱۵۰۵ء اور ۱۶۵۸ء کے عرصہ میں پرتگیزوں نے اس

[1] MADURA MISSION. & MALABAR RITES.

جزیرے پر قبضہ کر لیا تھا۔ بادشاہ کوٹے دکولمبی کینڈی اور ترنکومالی نے بپتسمہ لیا اور بعض جگہوں پر گاؤں کے گاؤں مسیحی ہو گئے۔ سنہ ۱۶۰۰ء تک آبادی کا بیشتر حصہ مسیحی تھا۔ کسی دوسرے پرتگیزی علاقہ میں مسیحیوں کی اتنی تعداد نہ تھی۔ مسیحیوں کی تعداد بروز بڑھتی ہی گئی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ کئی علاقوں میں مسیحی اکثریت میں تھے۔ سنہ ۱۶۵۸ء میں ولندیزی پروٹسٹنٹوں نے پرتگیزوں کو مار بھگایا۔ پرتگیزوں کی حکومت کا مذہب رومن کیتھولک تھا۔ لہٰذا ولندیزیوں نے اسے دبانے کی کوشش کی۔ وہ اس کی جگہ اپنی حکومت کی طرف سے مقرر کردہ مشنریوں کے وسیلے مسیحیت قائم کرنا چاہتے تھے لیکن پھر بھی رومن کیتھولک لوگوں کی تعداد پروٹسٹنٹ لوگوں سے زیادہ تھی۔

۹۔ برما۔ سیام۔ ہند چینی۔ ملایا اور ایسٹ انڈیز۔

پہلے تین ممالک میں پرتگیزوں کے قبضے میں کوئی علاقہ نہ تھا۔ اس جگہ بدھ مت کا سکہ جاری تھا۔ مسیحی ہونے والوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ سنہ ۱۵۱۱ء سے پرتگیز ملاکا[1] پر حکمران تھے۔ سنہ ۱۶۴۱ء میں ولندیزیوں نے اسے فتح کر لیا۔ محدود پیمانے پر یہاں بھی گوا جیسی مذہبی حالت تھی۔ ملایا اور دیگر مقامات پر بھی مسیحیت کو زیادہ کامیابی نہ ہوئی کیونکہ ان مقامات پر اسلام کی اشاعت ہو چکی تھی۔ زیویر نے دیکھا کہ ایسٹ انڈیز[2] سے بھی وہی طریقہ استعمال

[1] MALACCA [2] THE EAST INDIES.

کیا جا رہا ہے اور وحشی باشندوں کو مسلمان بنایا جا رہا ہے اب ان شاہراہوں پر جو عربوں کے قبضے میں تھیں مسیحی لوگ قابض تھے لیکن یہاں مشنریوں کی ضرورت ہے۔

۸۔ جاپان:۔ ہماری تحویل میں جو تاریخی مواد موجود ہے وہ اس نام نہاد مسیحیت کا ہے جو پرتگیزی دور میں ہی پھیل رہی تھی لیکن ان علاقوں میں جو پرتگیزی تسلط سے آزاد تھے مسیحیت کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ مولوکاس[1] کے تذکرہ میں ہم نے اس کی واضح مثال دیکھی ہے اور مشرق بعید میں یہ بات اس سے بھی زیادہ درست تھی۔ زیویر نے ان الفاظ پر زور دیا ہے کہ کسی دوسرے مقام کی نسبت جاپان اور چین میں عمدہ فصل کاٹنے کے لئے تیار کھڑی ہے"۔ زیویر اس وقت فلپائنز کے جنوب میں مولوکاس کے مقام پر تھا، جب اس نے پرتگیزوں اور جاپانیوں کے مابین تجارت کے متعلق سنا تو اس وقت تک جاپان میں مسیحیت کی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ ملاکا میں ایک جاپانی سے ملا۔ اس کے بعد وہ اور جاپانی اس کے آشنا بن گئے اس کے بعد ان تینوں کو بپتسمہ دیا گیا۔ گویا انہیں اُن کو دینی تعلیم و تربیت دی گئی۔ اب یہ تینوں دیگر تین جیسوئٹس کے ساتھ سنہ ۱۵۴۹ء میں تبلیغی مہم پر روانہ ہو گئے۔ جاپان میں چین کے مذہبی اور ثقافتی عناصر مدت سے رائج تھے اور جاپان ایسی چیزوں کا عادی ہو چکا تھا۔ بدھ مت جو چین کے راستہ ہندوستان سے آیا رو بہ زوال تھا۔

[1] MOLECUS.

اور سینکڑوں لوگ کسی نئے مذہب کی تعلیم سُننے کے لیے تیار بیٹھے تھے خواہ وُہ مذہب دُور مغرب سے ہی کیوں نہ آیا ہو۔ ۱۵۶۹ء تا ۱۵۸۲ء شوگن[1] یعنی جنرل جو حقیقت میں شہنشاہ کی کُل قوّت کا سرچشمہ تھا، مسیحیت کو دِل سے پسند کرتا تھا۔ پس ایک ہی پُشت میں چند مشنریوں نے دو سو کلیسائیں قائم کرلیں جن میں ایک لاکھ پچاس ہزار مسیحی تھے۔ اور یہ تعداد ساری آبادی کا ایک فی صد حصّہ تھی۔ ۱۶۰۶ء میں مسیحیوں کی تعداد کم ازکم تین لاکھ تھی۔ مسیحیوں میں بڑے بڑے افسر بھی تھے۔ ناگاساکی[2] کا شہر جو غیر ملکی تجارت میں ترقی کر رہا تھا مسیحیت کا مرکز بن گیا۔ اس کے بعد قومی مزاج میں بیداری پیدا ہوئی اور ایک اور جنرل (شوگن) منتخب ہوا، کیونکہ پرتگیزیوں اور ہسپانیوں کی طرف سے خطرہ تھا، لہٰذا قوم میں تبدیلی آگئی۔ ۱۶۱۴ء میں ایک فرمان جاری ہوا کہ سب مشنری مُلک سے نکل جائیں۔ گرجوں کو مسمار کیا جائے اور مسیحی اپنے عقیدے سے توبہ کرکے اس سے دستبردار ہو جائیں۔ ہزاروں مسیحیوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ ان میں کئی مشنری بھی شامل تھے، بعض کا سر قلم کیا گیا بعض کو جلایا گیا اور بعض کو صلیب دی گئی۔

۱۶۳۹ء سے جاپان کی یہ پالیسی رہی کہ اسے غیر ممالک کے ساتھ تعلقات سے دُور رکھا جائے۔ لیکن ولندیزیوں کے ساتھ ایک بندرگاہ میں تجارت کا سلسلہ جاری رہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہُوا کہ

[1] SHOGUN [2] NAGASAKI.

مسیحیت سے نجات حاصل کی جائے لیکن مشنری چوری چوری اس مُلک میں آتے رہے حتیٰ کہ ۱۷۰۸ء میں بھی ایک مشنری جاپان میں وارد ہُوا۔ مشنریوں کی سزا، قید، ایذا رسانی اور موت ہُوا کرتی تھی۔ ایک بڑی حیران کُن بات یہ ہے کہ جب ۱۸۶۵ء میں جاپان نے مشنریوں کو تبلیغ کی اجازت دے دی تو ایک مشنری کی پندرہ جاپانیوں سے مُلاقات ہُوئی جنہوں نے اُسے بتایا کہ اس جزیرے میں ناگاساکی کے مغرب میں اور پہاڑی علاقہ میں مشرق کی طرف پچاس ہزار مسیحی ہیں جو ابھی تک اپنے مسیحی ایمان پر قائم ہیں اور وُہ دو صدیوں سے اپنے بچّوں کو مسیحی تعلیم دے رہے ہیں۔

۸۔ چین:۔ زیویر نے جاپان میں یہ اندازہ لگایا کہ چین دُنیا کی ایک بہُت ہی بڑی اور اہم قوم ہے۔ چین کے اربابِ اختیار اہلِ یورپ کو بحری شیاطین[1] کے نام سے بُلاتے تھے۔ اُنہوں نے اہلِ یورپ کو ایک چھوٹے سے جزیرے کے ساتھ تجارت کی اجازت دے رکھی تھی۔ یہ جزیرہ کانٹن[2] ڈیلٹا سے پرے تھا۔ جب زیویر یہاں پہنچا تو اُس نے ایسے چینی ملاحوں کو تلاش کیا جو اُسے چھپا کر مُلک میں لے جائیں، لیکن چینیوں کو معلوم تھا کہ اس جرم کی سزا موت ہے۔ زیویر نے اس کے متعلق لکھا ہے:۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ ہمیں دو خطرے ہیں۔ اوّل۔ ممکن ہے کہ مَلاح ہماری نقدی چھین لیں اور ہمیں کسی غیر آباد جزیرے میں چھوڑ

[1] OCEAN EVILS [2] THE CANTAN DALTA.

دیں۔ دوم۔ ممکن ہے کہ کانٹن کا گورنر ہماری ایذا رسانی کے درپے ہو اور ہمیں قید میں ڈال دے۔ یہ دونوں باتیں درست ہیں لیکن کچھ اور بھی خطرات ہیں جو ان سے کہیں زیادہ ہیں اِن کا چینیوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اِن خطرات کا شمار کرنا بے حد مشکل ہے لیکن میں صرف ایک کا ذکر کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہمیں کوئی اُمید نہیں ہے تاہم خُدا کی رحمت پر ہمارا ایمان ہے۔

"خُدا پر ایمان نہ لانا ایسا بڑا خطرہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی دُوسرا خطرہ نہیں ہے جس میں خُدا کے دُشمن ہمیں ڈال سکتے ہیں"۔

زیویر کا یہ آخری پیغام تھا۔ وہ ایک ایسی سرزمین میں جہاں تبلیغ ممنوع تھی ۱۵۵۲ء میں جہان عجز تسلیم ہُوا۔ اُس کے ساتھ اُس کا چینی ترجمان تھا۔ اُس نے انجیل کی خدمت میں لاتعداد دُکھ تکلیفیں برداشت کی تھیں۔

۱۵۸۳ء میں میتو ریکی[۱] جو اطالیہ کا جیسوئٹ[۲] تھا جنوبی چین میں وارد ہُوا۔ بیس سال کے عرصہ میں وہ چین کے دارالحکومت پیکنگ[۳] میں رہتا رہا۔ درباری حلقوں میں اُس کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ وہ چینی لباس زیب تن کرتا اور اُس کے اطوار و گفتار بھی چینی تھے۔ اپنے تبحر علمی کی بدولت سرکاری حلقوں میں اُس کے بے شمار دوست تھے۔ اس کے چینی دوست اُس کے گھر میں آتے اور اُس کے کلاکوں، موسیقی اور کیمرے شیشوں، ریاضی، نجوم اور جغرافیہ کے آلات اور کتب کو

۱۔ MATTEO RICCI ۲۔ JESUIT ۳۔ PEKING.

دیکھتے اور اُس کی تصاویر اور مصوّری کا بھی جائزہ لیتے۔ وہ غور سے دیکھتے کہ اُس کی کتابوں اور بائبل مُقدّس کی بڑی ہی شاندار جلد بندی کی گئی ہے۔ ریکی[۱] کو چینی علم و ادب پر عبور حاصل تھا۔ وہ چینی رسم و رواج کا بے حد احترام کرتا تھا۔ جب وہ خُدا کی ہستی کے متعلق باتیں کرتا تو وہ چینی ادبِ عالیہ کی اصطلاحات استعمال کیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ وہ رسُومات جن کے ذریعہ کنفیوشیس[۲] اور آبا و اجداد کی عزّت کی جاتی ہے اُنہیں عبادت نہیں سمجھنا چاہیئے اور یہی وجہ ہے کہ یہ باتیں مسیحی ایمان کے ساتھ متصادم نہیں ہیں۔ ۱۶۱۰ء میں جب وہ فوت ہُوا تو وہاں دو ہزار پانچ سو مسیحی تھے۔ ان میں ایک بہت بڑا سرکاری افسر بھی تھا۔ شہنشاہ سے تعلق رکھنے والے ایک خاندان کے سات افراد اور دربار کی چھ بیگمات تھیں۔ اس طرح سے عوام مسیحیت کو قبول کرتے رہے۔ ۱۶۴۴ء میں جب منچو[۳] خاندان شمال کی طرف سے چین پر حملہ کر رہا تھا تو ولی عہد، ملکہ اور شہنشاہ کی دو بیوہ بیگمات کو بپتسمہ دیا گیا۔ شہزادے کے بپتسمہ کا نام کانسٹنٹائن تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا رُومی سلطنت کی تاریخ پھر دُہرائی جائے گی؟

منچو خاندان کو فتح ہُوئی تاہم جیسوئٹس کے ارادے بڑے بلند تھے۔ ۱۵۹۱ء تا ۱۶۶۶ء جرمنی کے ایک شخص فادر جان آدم شال وان بیل[۴] کو سرکاری منجم تعینات کیا گیا۔ منچو حکمرانوں پر اُس کا بڑا اثر

۱۔ RICCI ۲۔ CONFUCIUS ۳۔ MANCHUS ۴۔ FATHER JOHN ADAM SCHALL VON BELL.

تھا - شال نے لکھا ہے :-

"جس طرح زمانہ قدیم میں ایک ستارہ مجوسیوں کو خدائے برحق کی حضوری میں لے آیا تاکہ وہ اُسے سجدہ کریں، ممکن ہے کہ اسی طرح علمِ نجوم کے ذریعہ سے شرق بعید کا شہزادہ خدا کو پہچان سکے، اور اُس کی عبادت کرے۔"

ایک اور اُمید بر نہ آسکی - اگلا شہنشاہ کانگ شی[۱] منچو خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ تھا - وہ یورپ کے علوم کا طالب علم تھا - اُس نے پانچ ماہ تک ہر روز فادر وربی اسٹ[۲] سے یورپ کے علوم کا مطالعہ کیا - اس شہنشاہ کو مشرف بہ مسیحیت ہونے کی ترغیب نہ دی جاسکی، لیکن اُس نے مشن کے کام کو بڑی کامیابی عطا فرمائی ۱۶۹۲ء میں اُس نے ایک شاہی فرمان جاری کیا جس کے ذریعہ تمام سلطنت میں مسیحی عبادت کرنے کی آزادی مل گئی - مقامی حُکام کو علم تھا کہ دربار میں جیسوئٹس کو بڑا اثر و رسوخ حاصل ہے، اس لئے انہوں نے کوئی مداخلت نہ کی - اس وقت تک تین لاکھ مسیحی تھے - یہ مسیحی سوائے دُور مغرب کے باقی ہر ایک صُوبے میں رہتے تھے - جیسوئٹس کے علاوہ ڈومینکی[۳]، فرانسسکی اور دیگر حلقوں کے افراد بھی تھے جو مسیحیت کی اشاعت میں حصّہ لے رہے تھے -

لیکن اس کے بعد ڈومنکی حلقہ میں جیسوئٹس کے متعلق ایک بڑا اختلاف پیدا ہوگیا کہ مسیحیت کو کس طرح چینی رسم و رواج کے مطابق

[۱] K'ANG - HSI [۲] FATHER VERBIEST [۳] DOMINICANS.

ڈھالا جاسکتا ہے - رسم و رواج کے متعلق بحث و مباحثہ کی آواز رُوم تک جا پہنچی - یورپ کے علما نے اس پر اظہارِ خیال کیا اور ایک صدی تک یہ چیز بحث و مباحثہ کا موضوع بنی رہی - ۱۶۳۴ء - ۱۷۴۲ء کے دور میں دو سوال مرکزی حیثیت رکھتے تھے :-

اوّل :- کیا مسیحی خُدا کے لئے کنفیوشیس ادب سے شنگ تی[۱] اور تائن[۲] کے الفاظ استعمال کئے جاسکتے ہیں یا انہیں صرف تائن چو[۳] یعنی "خداوند آسمان" کی اصطلاح استعمال کرنی چاہیئے؟

دوم :- کیا مسیحی دُوسرے اہلکاروں کے ساتھ مل کر رسُومات ادا کر سکتے ہیں اور کنفیوشیس کا بلحاظ "واضعِ قانُون" احترام کر سکتے ہیں - اس سے اس کی عبادت مقصُود نہیں ہے اور کیا ایک مسیحی اپنے خاندان کے دیگر شرکا کے ساتھ مل کر اپنے آباو اجداد کا یُوں احترام کر سکتا ہے کہ اُن کی پُوجا نہ ہو؟ شہنشاہ کانگ شی[۴] اس معاملے میں بڑی دلچسپی لیتا تھا اور اُس نے دونوں معاملات میں ریّکی کے خیال کی حمایت کی - لیکن جب ۱۷۰۴ء میں پوپ کے فیصلہ کا اعلان ہُوا تو اُس نے ایسا کرنے سے منع کر دیا - آج بھی پوپ کے فیصلے کی نقل چینی زبان میں محفوظ ہے اور اس پر شہنشاہ نے سُرخ سیاہی سے غصّے سے اپنی اختلافِ رائے کا اظہار کیا ہُوا ہے -

"اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چین کے اعلیٰ قوانین کے متعلق اہلِ مغرب کتنے تنگ نظر ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی چینیوں جیسا عالم نہیں

[۱] SHAN-TI [۲] TIEN [۳] TIEN-CHU [۴] K'ANG-HSI.

ہے۔ اس فیصلے کا مصنف بدھ یا کسی دوسرے تاؤسٹ پجاری کی طرح ہے لیکن ابھی تک کسی نے اتنی جرأت نہیں کی ہے، اس لئے مغرب کے کسی باشندے کو چین میں اپنے مذہب کی اشاعت کی اجازت نہیں ہوئی اور یوں ہم کئی مصیبتوں سے بچ جائیں گے۔"

لیکن کانگ ہشی کی یہ دھمکی پوری نہ ہو سکی۔ پیکنگ مشن پر، جو علم نجوم اور دیگر کاموں کی وجہ سے دربار کے ساتھ منسلک رہی، ۱۸۰۰ء تک اس پر کسی قسم کی کوئی سختی نہ ہوئی لیکن ۱۸۰۵ء سے لے کر ایک سو پچیس سال تک دوسرے مقامات میں مسیحیوں پر ایذا رسانی ہوئی۔ مسیحیوں کو گرفتار کر کے قید میں ڈالا جاتا تھا، بعض کو ملک بدر کیا گیا اور بعض کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، لیکن مشنریوں کی آمد میں کمی نہ ہوئی، اگرچہ اب ان کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ وہ کئی دوسرے راستوں سے اس ملک چین میں آنے لگے۔ بعض اوقات انہیں اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا پڑتا تھا۔ ۱۸۱۱ء میں اکیلی یورپین اور اسی چینی خادمانِ دین چین کی مملکت میں بشارت کی خدمت سرانجام دے رہے تھے اور اگرچہ بشارت کا کام اب خفیہ طور پر کیا جاتا تھا تاہم مسیحیت اس سرزمین سے بالکل ختم نہیں ہوئی تھی۔ جب انیسویں صدی کے وسط میں حالات پھر سازگار ہو گئے تو سوا دس لاکھ ارکان کی کلیسیا یسوع کی حمد و ثنا گانے لگی۔ اسی کلیسیا نے اس نئی صبح کا خیر مقدم کیا۔

ما بعد تحریر

عظیم عہد کی آمد

گزشتہ ابواب کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ مسیحی کلیسیا میں جو احیاء کی تحاریک پیدا ہوئی تھیں، انہوں نے آخرکار مشنری صورت اختیار کر لی۔ اس کی واضح مثالیں راہب، فرائر اور جیسوئٹس ہیں۔ راہب ایک خاص قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں جس میں وہ دنیا سے بالکل بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ یہی راہب پرانے زمانے کا مشنری ہے۔ فرائر خدا کی آواز سنتے ہیں کہ دنیا میں انجیل کی منادی کی جائے اور ایک ہی صدی میں انہوں نے اطالیہ سے شمالی افریقہ اور فارس سے چین تک انجیل کا پیغام پہنچا دیا۔

جیسوئٹ کلیسیا کا مخلص سپاہی ہے۔ اس کے کام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک عالم گیر مہم کا داعی ہے۔ احیائے کلیسیا کی وہ تحریک جو مشنری روح سے عاری تھی تحریکِ اصلاحِ کلیسیا تھی۔ کلیسیا کے مغرب کے وہ حصص جو سولھویں صدی میں پوپ کی قیادت سے آزاد ہو گئے ان میں سترھویں اور اٹھارویں صدی میں احیاء کی تحریکیں جاری ہوئیں۔ یہ تحاریک سب سے پہلے جرمنی میں شروع ہوئیں اور شمالی امریکہ اور

برطانیہ میں بھی پھیل گئیں۔ اس طرح سے ۱۷۰۶ء میں لوتھرن مشنیں شروع ہوئیں اور ۱۷۹۰ء میں مکمل مشنری بیداری نعروں پر پیدا ہوگئی۔ نئے زمانے میں نئے مواقع میسر ہوئے۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے دیگر ممالک کے ساتھ تجارت شروع ہوئی۔ اس دفعہ پروٹسٹنٹ مشنریوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے بھی نئی نئی تحاریک شروع کیں اور اپنے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ پس انیسویں صدی میں سب سے زیادہ مسیحیت کی اشاعت ہوئی۔ بیسویں صدی نے مسیحیت کے لئے جو کچھ مہیا کیا ہے اس کا اندازہ لگانا بڑا ہی مشکل ہے۔ وہ خوفناک جنگوں نے کئی نئے طریقے ایجاد کئے اور پرانے طریقے ختم ہو گئے۔ ان خوفناک سالوں میں غیر ملکی کام ختم ہونے لگا اور کلیسیا کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ہم اس عالمگیر کلیسیا کے رکن ہیں اس لئے جو کام ابھی تک ختم نہیں ہوا حتی المقدور اس کی اہمیت کا اندازہ لگانا ہمارا فرض ہے۔

خدا نے پیش بینی کر کے ہمارے لئے کوئی بہتر چیز تجویز کی تھی تاکہ وہ ہمارے بغیر کامل نہ کئے جائیں۔

(عبرانیوں ۱۱: ۴۰)

(پی۔ آر۔ بی۔ ایس پریس لاہور میں باہتمام مسٹر وی۔ ایس کے خضل سیکرٹری پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی انارکلی لاہور چھپ کر شائع ہوئی)